نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

نقوشِ اقبال

مولانا ابو الحسن علی ندوی کی عربی کتاب
"روائع اقبال" کا ترجمہ
اضافوں اور نظرِ ثانی کے بعد

از

مولوی شمس تبریز خاں
رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام (پوسٹ بکس ۱۱۹) لکھنؤ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

سلسلۂ مطبوعات
۲۵

نقوشِ اقبال

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کی

عربی کتاب "روائع اقبال" کا ترجمہ بعض اضافوں اور خود مصنف
کی نظرِ ثانی کے بعد

ترجمہ

از مولوی شمس تبریز خاں
رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

مطبوعہ
نامی پریس لکھنؤ ۳

۱۳۹۰ھ ——— ۱۹۷۰ء

تعداد ... ... ایک ہزار
قیمت ... ... ساڑھے چار روپے

طابع و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

نقوش

اقبال

① عربی	(دمشق، بیروت)	دوسرا ایڈیشن
② اُردو	(لکھنؤ)	پہلا ایڈیشن

فہرست نقوش اقبال

کچھ ترجمہ کے بارے میں

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی "روائع اقبال" کے اردو ترجمے کی کئی حیثیتوں سے ضرورت تھی، اردو دنیا، اقبال اور مولانا سے تعلق رکھنے والوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ روائع کا اردو ترجمہ ہو، اس لئے کہ اقبال اور مولانا مدظلہٗ کی فکری ہم آہنگی کا یہ فطری تقاضا تھا کہ ایک زندۂ جاوید ہستی پر ایک زندہ شخصیت کے خیالات سے استفادہ کیا جائے۔

مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی کسی چیز کی اہمیت علمی و ادبی قدر و قیمت کے ساتھ اس کی اسلامیت اور ان کے دعوتی طرز نگاہ کے پہلو سے بھی ہوتی ہے۔ اردو میں اقبال پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "روح اقبال" مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کی "اقبال کامل" اور خلیفہ عبدالحکیم کی "فکر اقبال" بہت اہم سمجھی جاتی ہیں، جن میں اقبال کے افکار کی تنقید و تحلیل بڑے عالمانہ انداز میں ہو چکی ہے، لیکن خلیفہ عبدالحکیم نے صحیح لکھا ہے کہ اقبال کا موضوع ایسا ہے کہ اس پر کچھ مزید لکھنے کیلئے کسی

معذرت کی ضرورت نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کو خاص طور پر ان کے دینی رجحان اور دعوتی میلان کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش اب تک بہت کم ہوئی ہے۔ روائع میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اقبال کے قلب و روح تک پہنچنے اور اس کی چند جھلکیاں دکھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے تنقید و تحلیل، علمی تشریح و تجزیہ اور کسی حاشیہ آرائی کے بجائے اقبال کی ترجمانی کے لئے کلام اقبال کو رہنما بنایا گیا ہے یہ طرز جدید تنقید کے معیار پر بالکل پورا نہ بھی اترتا ہو تو بھی اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

کسی مفکر کے قلب و نظر تک رسائی کے لئے یہ سب سے اچھا طریقہ ہے کہ براہ راست اس کے کلام سے استدلال کیا جائے اور اسے اس کے پیام میں دیکھا جائے، ع

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اقبال کے ہاں جذبہ اور خیال کی شانی ہم آہنگی پائی جاتی ہے ان کے قلب و نظر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ایمان ویقین کے نور سے روشن نہ ہو۔ اور جس پر اسلامیت کی چھاپ نہ لگی ہوئی ہو۔ اقبال نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ علم وادب، مذہب وتہذیب، معیشت ومعاشرت، تاریخ وسیاست کے ہر پہلو سے بحث کی ہے اور انھیں اپنے افکار کا موضوع بنایا ہے لیکن ان سب میں اگر کوئی چیز قدرِ مشترک کہی جاسکتی ہے تو وہ ان کی اسلامیت اور مومنانہ اندازِ نظر ہے جو ان کے علوم وفنون کی ہر شاخ میں اس طرح رواں دواں ہے کہ ع

شاخ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم!

اسلام نے انھیں شدت سے متاثر ہی نہیں کیا ہے بلکہ وہ انکا آخری اور قطعی عقیدہ وایمان بھی بن گیا ہے اور اس ایمان نے انھیں زندگی کے ہر مسئلے میں ایک واضح ہدایت دی ہے۔

اقبال فلسفی پہلے ہوں یا شاعر بہر حال انھوں نے شعر ہی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے اس لئے اب ان کے افکار کو جب بھی سمجھنے کی کوشش کیجائے گی تو فنی نقطۂ نظر کو مقدم رکھنا ضروری ہو گا اس لئے کہ شعر کے لئے فکر کی اتنی اہمیت نہیں جتنی جذبہ کی شدت احساس کی واقعیت اور خلوص کی حرارت کی ہوتی ہے ——— اسلام سے اقبال کا لگاؤ صرف فکری نہیں بلکہ جذباتی بھی ہے۔ فکر کی مئے مینا گداز ان کے ہاں جذبہ کی آنچ سے دو آتشہ ہو گئی ہے۔ اقبال کو خالص عقلی سطح سے سمجھنے کی کوشش کرنا برگ گل کی کیمیائی تشریح و تجزیہ کرنے کے مرادف کہا جا سکتا ہے اقبال کے سوز و ساز اور درد و گداز، ان کے دلوں کی تپش اور ان کی شبوں کی خلش کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ عقل کی غلامی سے آزاد دل کی رہنمائی میں ان کے احوال و مقامات کی سیر کی جائے۔

اقبال ولایت عشق کے سپاہی اور دیار مہر و وفا کے راہی ہیں، انھوں نے عالمی ادبیات کی تاریخ میں پہلی بار اتنے شور و شعور اور اتنے جوش و ہوش کے ساتھ عقل کے خلاف آواز اٹھائی اور عشق کی حیثیت عرفی بحال کی۔

انھوں نے دور جدید کے عقلی آزر کدوں میں از سر نو رومی و سنائی، عطار اور جامی کے دلوں کا سوز عام کیا۔ انھوں نے عقل کی زیاں کاریوں کا علاج عشق و محبت کی دوائے دل سے کیا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ عہد حاضر میں انھوں نے انسان کے قلب و ضمیر، اس کی روحانیت و معنویت، اور اس کی باطنی قوت کی بازیافت کی۔ اور عقل و دماغ، فکر و نظر کے مسلسل سفر کے بعد بھی انسان کو جو منزل نہیں میسر آسکی تھی۔ اسے عشق کی ایک جست میں وہاں پہنچا دیا اقبال کے کارنامے کی دہری حیثیت اس وقت ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے فلسفہ و سائنس کے عہد میں انسان کو اس کے باطنی سرچشمہ تک پہنچایا اور اس کی طرف متوجہ کیا، دوسرے مسلمانوں کے سامنے عشق و محبت کی شاہراہ مقصود کھول کر اسلام کو از سر نو روشناس

کیا اور اس کے روحانی اور اخلاقی انقلاب کی عظمت بھی دوبالا کی۔

سپاہ تازہ برانگیزم ازولایتِ عشق،

کہ درحرم خطرے از بغاوتِ خرد است!

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ روائع میں اقبال کے باطن، ان کی اندرونی شخصیت، اور ان کے قلب و روح کو اس کی فطری حالت میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جہاں وہ خدا کی حمد کرتا ہے۔ اور اس کا دل خدا و رسولؐ کی محبت میں سرشار اور بیقرار نظر آتا ہے۔ جہاں وہ اسلام کی عظمت رفتہ پر آنسو بہاتا ہے، جہاں وہ تاریخ اسلام کے عروج و زوال پر نظر بازپسیں ڈالتا ہے۔ جہاں وہ اسلامی نظام حیات کے غم میں گھلتا ہے، جہاں وہ مومن کے جلال و جمال کے ترانے گاتا ہے۔ جہاں وہ اسلام کے مستقبل سے پرامید نظر آتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنوں پر اگر کان لگائے جائیں تو یہی آوازیں اس میں گونجتی سنائی دیں گی اس کا کلام انھیں دھڑکنوں کی رُوداد اور ان کا ریکارڈ ہے۔

فیضی گماں مبر کہ غمِ دل نہفتہ ماند

اسرارِ عشق آنچہ تواں گفت، گفتہ ایم!

اس کتاب میں آپ کو جگہ جگہ اقبال کے عشق رسول کا تذکرۂ شوق انگیز ملے گا۔ اس بوئے گل سے ان کا نفس نفس مشکبار اور ان کی سطر سطر عطر آگیں ہے اقبال کی شخصیت کے عناصر اربعہ کی اگر تلاش کی جائے تو شاید خدا پر ایمان، رسولؐ سے عشق، اسلام کی ابدیت پر یقین، اور مردِ مومن کے امکانات اور اس کی ذات سے بے پایاں محبت ہی کی دریافت ہوگی۔

مخدومی رشید احمد صدیقی نے بہت صحیح کہا ہے کہ اقبال پر دنیا کے بڑے مذہب کی گرفت اتنی نہیں جتنی ایک بڑی شخصیتؐ کی ہے،

اب نفس کتاب سے متعلق چند تصریحات ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ فکری لحاظ سے بھی اقبال اور مغربی تہذیب و ثقافت، اقبال اور عصری نظام تعلیم اقبال کا نظریۂ علم وفن، انسان کامل اقبال کی نظر میں، شخصیت اقبال کے تخلیقی عناصر۔ اس مجموعہ کے اہم مضامین ہیں۔ دونوں موخرالذکر ترجمے جناب طیب صاحب عثمانی ندوی کے ہیں جو ان کی کتاب "حدیث اقبال" سے لئے گئے ہیں، اقبال درِ دولت پر کا ترجمہ مولانا محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" کے قلم سے ہے۔ جو "کاروان مدینہ" سے لیا گیا ہے۔

روائع اقبال کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس کے اولیں مخاطب عرب تھے او یہ انھیں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی اس لئے اس میں اقبال کے کلام کے وہ حصے خصوصیت سے لئے گئے تھے جو عربوں سے متعلق تھے مثلاً بلاد عربیہ کے نام۔ پس چہ باید کرد کی "حرفے چند باامت عربیہ" کا ترجمہ ہے۔ مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، طارق کی دعا، ابوجہل کی نوحہ گری، جاہلیت کی بازگشت بھی عربوں سے متعلق ہے لیکن عجم کے صاحب ذوق بھی ان سے پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

روائع کا مقصد عرب ممالک میں اقبال کا تعارف تھا اس لئے ان کے سوانح و افکار کے اجمالی جائزہ کے ساتھ ہی ان کی چند بہترین شاہکار نظموں کا ترجمہ بھی کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی بہترین نظمیں اس مجموعہ میں آگئی ہیں۔ یعنی مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ابلیس کی مجلس شوریٰ ساقی نامہ، جاوید نامہ اور مثنوی مسافر کے اہم حصے بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ اردو میں اس ترجمے کے ترجمے کا زیادہ لطف تو نہیں۔ لیکن مصنف کے جذبات و خیالات کی ...... اہمیت کے پیش نظر اس کا بھی ایک خاص مقام ہے ـــــــ "روائع اقبال" کی عرب دنیا میں بڑی اہمیت ہے اس سے پہلے جناب عبدالوہاب عزام (سفیر مصر) نے اقبال کا عربی میں منظوم ترجمہ کیا تھا اور ایک مصری فاضل عباس محمود نے "تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام" بھی لکھی تھی۔

لیکن اقبال کا تعارف نہیں ہوسکا تھا چنانچہ عالم عربی کے اسلامی ادیب علی طنطاوی نے مولانا کے نام مجلہ المسلمون (دمشق) میں ایک کھلا خط شائع کیا جس میں انھیں اس کام کی طرف متوجہ کیا گیا تھا مولانا نے انہی تقاضوں کے پیش نظر چند مضامین سپرد قلم کئے جو کتاب بن گئے "روائع اقبال" منظوم ترجمہ نہیں لیکن اس کی فصاحت وادبیت اتنی مسحورکن ہے کہ اسے شعر منثور کہا جاسکتا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ اردو ترجمہ میں اصل کی خوبیاں نہیں آسکی ہیں،

یہ کتاب اقبالیات میں کوئی اہم اضافہ تو نہیں لیکن اقبال کے شائقین کی دلچسپی کی چیز ضرور ہے اور اپنے بعض پہلوؤں خصوصاً دعوتی طرز فکر کی صحت اور ذوق کی اسلامیت کے لئے ممتاز ہے ویسے بھی اقبال کے سلسلے میں کوئی حرف آخر کہنے کا دعوا کیا بھی نہیں جاسکتا۔

شوق گر زندہ جاوید نباشد عجب است
کہ حدیث تو دریں یک دو نفس نتواں گفت!

شمس تبریز خاں، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یکم ربیع الاول ۱۳۸۹ھ ہجری
مطابق ۱۹ مئی ۱۹۶۹ء

میرا تعلق اقبالؒ اور انکے فن سے

میری نشو و نما اس عہد میں ہوئی جب اقبال کا فن شہرت کے بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اقبال کا اپنے عہد پر جو اثر تھا اس کی مثال کسی زمانے کے شاعر و ادیب میں نہیں ملتی، اس لئے اگر میں نے انھیں اپنے بچپن میں پسند کیا اور جب سن تمیز کو پہونچا تو میں نے ان کو اپنا موضوع بنایا۔ تو یہ محل تعجب نہیں۔

اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے۔ انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے انسان بہت خود بین و خود پسند واقع ہوا ہے اس کی محبت اور نفرت تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور بڑی حد تک اس کی ذات ہی ہوتی ہے اس لئے اسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے جو اس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اسکے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے میں بھی اپنے

کو اس کلیہ سے الگ نہیں کرتا میں نے کلام اقبال کو عام طور پر اسی لئے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا، اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے، وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ اکثر میرے شعور اور احساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔

سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں۔ میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے۔ جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں ــــ ــــ وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گزشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکرمند تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔

میں نے بچپن اور عنوانِ شباب میں ان کے شعر پڑھنا شروع کئے بعض نظموں کو عربی کا جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی لیکن صحیح یہ ہے کہ میں نے اس وقت صرف "بانگ درا" پڑھی تھی ان کے فارسی مجموعے نکل چکے تھے لیکن اس وقت تک میں ان کا ذوق شناس نہیں ہوا تھا۔

اقبال سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی جب میں اپنی عمر کے سولہویں سال میں تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب میں نے شہر علم و ثقافت ــــ لاہور ــــ کی سیر کی۔ مئی کے آخری گرم دن تھے جب ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی (حال استاذ اسلامی فن تعمیر پنجاب یونیورسٹی) مجھے اقبالؒ کی خدمت میں لے گئے

اور مجھے ان کے شعر کے شائق کی حیثیت سے پیش کیا وہاں انھوں نے میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (م ۱۳۴۱ھ) کا بھی ذکر کیا جنھیں اقبال اور دوسرے ادیب و نقاد ان کی گرانقدر کتاب "گل رعنا" کی وجہ سے جانتے تھے جو تازہ نکلی تھی اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

میں نے اس صحبت میں ان کی نظم "چاند" کا عربی ترجمہ انھیں پیش کیا اقبال نے اسے دیکھ کر مجھ سے بعض عرب شعراء کے متعلق کچھ ایسے سوالات بھی کئے جن سے میری معلومات کا اندازہ ہو ——— اس کے بعد مجلس ختم ہوئی اور میں اس عظیم شاعر کی تواضع، سادگی، بے تکلفی کا نہایت اچھا اثر لے کر واپس ہوا۔ جو ان کی بات چیت اور زندگی میں نظر آتی تھی۔

۱۹۲۹ - ۱۹۳۷ء کے درمیان لاہور میرا اکثر جانا اور مہینوں ٹھہرنا ہوتا لیکن یہ سوچ کر اس عظیم شاعر سے ملنے کی تمنا نہیں پیدا ہوتی تھی کہ ابھی تو وہ بہت دنوں ہمارے درمیان رہیں گے، ویسے بڑے لوگوں سے ملنے کے معاملے میں میں طبعاً شرمیلا، اور عزلت پسند واقع ہوا ہوں میری طالب علمانہ زندگی اور مصروفیت کو بھی اس میں دخل تھا۔

اس مدت میں ان کے دو اردو مجموعے ان کی فارسی گوئی کے طویل زمانے کے بعد ظاہر ہوئے تھے اسلامی اور ادبی حلقوں میں ان کا بڑا چرچا تھا اور واقعہ بھی یہ تھا کہ ان میں ان کی شاعری اور ان کے فکر کی پختگی بہت نمایاں اور ان کی دعوت بہت واضح تھی۔

اس وقت "ضرب کلیم" کو میں زیادہ پسند کرتا تھا اگرچہ بعد میں "بال جبریل" کی طرف میری توجہ اور دلچسپی بڑھتی گئی۔ اور نقل و ترجمہ کا کام زیادہ تر اسی سے لیا گیا۔

میں اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی فرائض انجام دیتا تھا۔ برادر محترم مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ ہی مقیم تھا۔ اس لئے اقبال کے شعر ہم ایک دوسرے کو سناتے اور لطف لیتے تھے۔ مولانا مسعود عالم صاحب کی اقبال کے بارے میں حمایت حمیت تک پہنچی ہوئی تھی وہ ان کے بڑے

پرجوش مبلغ تھے،

ہمیں یہ بات کھٹکتی تھی کہ ٹیگور، اقبال کے مقابلے میں بلاد عربیہ میں زیادہ روشناس ہیں اور مصر و شام وغیرہ کے عرب ادیب ان کے عام طور پر گرویدہ ہیں، ہم اس صورت حال کو اپنی ہی کوتاہی کا نتیجہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اقبال کو متعارف نہیں کرایا عربی مجلات میں ٹیگور وغیرہ پر جب کبھی ہم تعریفی مقالات دیکھتے تو اقبال کے عربی ترجمہ کا عزم تازہ ہو جاتا اور اسے اپنے ذمہ قرض و امانت سمجھنے لگتے

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسلام کے اس عظیم شاعر کی وفات سے چند ماہ پہلے ایک تفصیلی اور تاریخی ملاقات کا موقع ملا۔ (۱۶ر رمضان ۱۳۵۶ھ — ۲۲ر نومبر ۱۹۳۷ء) کی تاریخ تھی جب میں اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ حسنی سابق (استاذ اورینٹل کالج لاہور) کے ساتھ اقبال کے دولت کدے پر گیا، اور عزیز مولوی سید ابراہیم حسنی بھی میرے ساتھ تھے۔ یہ اقبال کی طویل علالت کا زمانہ تھا لیکن وہ بڑے نشاط و انبساط کے ساتھ ملے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں کی آمد سے انھیں یہ وقتی مسرت حاصل ہوئی ہو۔ غرض اس دن ان کی طبیعت کے بند کھل گئے تھے ہماری نشست بڑے خوشگوار ماحول میں تین گھنٹوں تک جاری رہی ان کا بوڑھا خادم (علی بخش) بیچ بیچ میں آکر انھیں زیادہ بیٹھنے اور بات کرنے سے روکنا چاہتا لیکن وہ اسے ٹال جاتے اس صحبت میں ہر طرح کے موضوعات زیر بحث آتے رہے۔ سلسلۂ گفتگو میں شعر جاہلیت کا ذکر آیا تو اقبال نے اس کی صداقت و واقعیت، اس کے جوش و خروش کا پسندیدگی کے ساتھ ذکر کیا۔ اور حماسہ کے بعض اشعار پڑھے۔

وہ کہنے لگے کہ اسلام اپنے پیروؤں میں عملیت اور حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے اور ادھر آج کی سائنس بھی اپنی حقیقت پسندی اور تخیلات سے گریز میں اسلام سے قریب نظر آتی ہے اسلام کی دو صدیوں میں مسلمانوں میں یہ روح زندہ رہی جس کے نتیجے میں وہ عقیدہ و عمل، سیرت و اخلاق کے جادۂ استوار پر گامزن رہے لیکن یونانی فلسفۂ الٰہیات نے مشرق کو مرد بیمار اور بیکار بنا دیا ——— یورپ

کی نشاۃ ثانیہ بھی اسی وقت ہوئی جب اس نے اپنے کندھوں سے فلسفۂ مابعد الطبعیات کا جوا اتار پھینکا، اور مفید نتیجہ خیز علوم کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن اس عہد میں وہ مسائل پیدا ہونے لگے جنھوں نے یورپ کو بھی رجعت پسندی کی لائن پر ڈال دیا۔ انھوں نے کہا کہ عربی مزاج اسلام کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا لیکن عجمی تخیلات نے اسلام پر وہی ظلم کیا جو کلیسا نے یورپ پر کیا تھا، مجموعی طور پر آرین فکر نے دونوں مذہبوں کو کم و بیش اپنی گرفت میں لے لیا۔

آپ نے تصوف کے ذکر میں بعض صوفیہ کے فکری غلو پر تنقید کی اور وجد سماع کے بارے میں کہنے لگے کہ صحابۂ کرامؓ کو بجائے ان خیال آرائیوں کے شہسواری اور جانسپاری میں طرب و اہتزاز اور راحت و مسرت محسوس ہوتی تھی۔

ہندستان میں اسلام کی تجدید و احیاء کی بات نکلی تو شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سلطان محی الدین، عالمگیرؒ کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جدّ وجہد نہ ہوتی تو ہندستانی تہذیب اور فلسفہ اسلام کو نگل جاتا۔ ـــــ پاکستان کے بارے میں فرمایا[1] کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب و تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین و تہذیب حکومت و شوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں۔ اسلئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے اور یہی اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے ضمناً انھوں نے اسلام کے نظام زکوٰۃ اور بیت المال کا بھی ذکر کیا۔

ہندستان میں مسلمانوں کا مستقبل کے بارے میں فرمایا کہ میں نے بعض مسلم والیان ریاست و حکومت کو غیر مسلموں میں تبلیغ کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں میں بھی دعوت کے کام پر زور دیا ہے اور عربی زبان کی ترقی اور ایک عالمی بنک کے قیام کے بارے میں بھی بات چیت کی ہے میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے معاملات کی وکالت کے لئے ایک بلند پایہ انگریزی اخبار بھی ضروری ہے جس سے ملت کی آواز میں طاقت

---

[1] یہ پاکستان کے وجود میں آنے سے پورے دس برس پہلے کی بات ہے۔

اور اثر پیدا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلم والیان ریاست نے مسئلے کی اہمیت نہیں سمجھی اور نہ انھیں خطرات کا احساس ہوا، ان کی تنگ نظری، پست خیالی اور خود غرضی کے وہ بہت شاکی تھے۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ ابھی اس صحبت کو کچھ اور طول دینا چاہتے ہیں لیکن ہم نے ان کے آرام کے خیال سے اجازت طلبی ہی مناسب سمجھی اور سلام کر کے رخصت ہوئے اور اسی دن یا دوسرے دن لاہور کو چھوڑا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس مجلس میں جب ان سے عربی ترجمہ کی اجازت لی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کی اجازت دی میں نے "ضرب کلیم" کی اپنی بعض پسندیدہ نظمیں بھی پڑھ کر سنائیں تو انھوں نے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے عربی ترجمہ کے ارادے کا بھی ذکر کیا چھ ماہ بعد ۲۱ راپریل ۳۸ء کو جب ہم نے ان کی خبر وفات سنی تو ان کے فن و شخصیت پر کچھ کام کرنے کا عزم اور پختہ ہو گیا، اور میں نے اس سلسلے میں رفیق محترم مولانا مسعود عالم صاحب کو پٹنہ خط لکھا جہاں وہ مقیم تھے ہم دونوں نے ایک دوسرے کی ماتم پرسی کی اور اس مہم میں تعاون کا وعدہ کیا۔ انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ وہ ان کی حیات و پیغام پر لکھیں اور میں انکے شعر کو عربی جامہ پنہاؤں اسلئے کہ ان کو ترجمہ کے کام سے زیادہ مناسبت نہیں ہے ـــــ چنانچہ کام شروع ہوا اور میرے مرحوم دوست نے استاد محب الدین خطیب کی ادارت میں قاہرہ سے نکلنے والے رسالہ "الفتح" میں اقبال پر ایک مؤثر مضمون لکھا۔ اور میں نے ان کی زندگی پر ایک مقالہ لکھا جو بہت بعد میں حجاز ریڈیو سے نشر ہوا۔ اس کے بعد تقریباً ۱۰ سال تک تعلیمی اور تصنیفی اشغال کی وجہ سے یہ سلسلہ بند رہا۔

۱۹۵۰ء میں جب حجاز، اور مصر و شام کے سفر کا اتفاق ہوا اور تقریباً ایک سال سے زائد قیام کا موقع ملا تو میں نے اقبال اور ان کے فکر و فن سے متعلق چند مقالات لکھے اور انھیں دارالعلوم، اور قاہرہ یونیورسٹی میں پڑھا۔

ایک اور مقالہ ۱۹۵۶ء کے سفر شام میں دمشق میں لکھنے کا اتفاق ہوا جو "محمد اقبال فی مدینۃ الرسول"

......کے عنوان سے دمشق ریڈیو سے نشر ہوا لیکن اقبال کے ترجمہ پر آمادگی نہیں ہو پاتی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے اس کام کو شروع کیا تھا جو اپنی عربی فارسی لیاقت، اور اقبال سے فکری تعلق کی بنا پر اس کے لئے بہت موزوں بھی تھے بعد میں ان کے تراجم کے کئی مجموعے سامنے آئے[1] لیکن میرے بعض دوستوں نے کہا کہ ترجمہ میں اصل کا زور اور تاثیر نہیں، اس لئے فکر اقبال کی واضح نقش آرائی اس سے نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اقبال کی شہرت کے شایانِ شان ہے۔

میں نے بھی ان ترجموں کو جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ترجمہ، علم و فہم اور ان کی نظم میں کوئی خامی نہیں بلکہ اصل خرابی یہ ہے کہ انھوں نے منظوم ترجمہ کا بیڑا اٹھا کر اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا جس سے اصل اور نقل دونوں کی خوبیاں سامنے نہیں آسکیں اور کہیں کہیں ژولیدگی نے اس پر اور اضافہ کر دیا جو قاری اور ذوق شعری کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

ان جیسے آدمی کے لئے جو عربی کا ادیب اور فارسی کا زباندان ہے یہ مناسب تھا کہ وہ فکر اقبال کو ہضم کر کے پھر اسے عربی نثر کا جامہ پہناتے جیسا کہ انھوں نے مصر کے مشہور رسالوں "الرسالہ" "الثقافہ" کے بعض موثر مقالات میں کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر زبان کی خاص فضا، نفسیات، اور تعبیرات ہوتی ہیں، جن کی جڑیں اس کی معاشرت اور تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

لفظی ترجمہ اگر ان باتوں سے خالی ہو گا تو اپنا جمال اور اپنی معنویت کھو دے گا۔

اس کے باوجود ڈاکٹر عزام کی خدمت اسلام و ادب کی ایک بڑی خدمت ہے جو ہر قدردانی اور شکر و اعتراف کی مستحق ہے اور خود ان کی عربیت، ان کے حسنِ طبیعت، عزم و اخلاص اور اسلامی فکر سے محبت کی دلیل ہے۔ یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں عزام سا ترجمان ملا۔ اقبال

---

[1] انکے نام یہ ہیں رسالۃ المشرق، ضرب الکلیم، انھوں نے اسرار خودی و رموز بے خودی اور جاوید نامہ کے کچھ حصوں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

کی روح ان کی اس محنت و محبت سے یقیناً بہت مسرور ہو رہی ہوگی اللہ انھیں جزائے خیر دے ______

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اپنی متنوع مصروفیات کے سبب ترجمہ کا کام شروع کرنے پر کوئی آمادگی نہیں تھی لیکن ایک واقعہ نے عزم خفتہ کو بیدار کر دیا اور نشاط تازہ ہوگیا۔ میں نے دمشق کے موقر رسالہ المسلمون میں عربی کے مشہور ادیب علی طنطاوی کا کھلا خط پڑھا جس میں انھوں نے مجھے شعر اقبال کے ترجمہ کی دعوت دی کہ اقبال کا، عرب میں تعارف ہو اور ان کی شاعری کے پیام کو صحیح شکل میں دیکھا جا سکے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ "کیا آپ شعر اقبال کے منتخب حصے کا ترجمہ کر کے ہمیں اقبال اور ان کے فکر و عقیدہ کی عظمت کو سمجھنے اور اس کا راز معلوم کرنے کا موقع عنایت کریں گے اسلئے کہ ان کے عربی ترجمے ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیوار کو پوری طرح نہیں ڈھا سکے ہیں۔ کیا آپ اس جلیل القدر خدمت کو اپنی خدمات میں شامل کریں گے اور اس نظروں سے اوجھل چمن زار کی سیر کا موقع دیں گے یا ہدیۂ شمیم و نکہت بھیج کر اس گلستاں سے محروم لوگوں کو نوازیں گے"؟[۱]

اس پیشکش کا جواب گرمجوشی سے دیا گیا اور اس نے بجھی اور تھکی ہوئی طبیعت میں از سر نو تازگی و آمادگی پیدا کر دی، جسکے نتیجے میں مسجد قرطبہ، کا ایک ہی نشست میں ترجمہ تیار ہوگیا۔ اور میں نے اپنے اندر ترجمہ کا ایک ایسا اندرونی تقاضہ اور جذبہ محسوس کیا جسکو میں دبا نہیں سکتا تھا اس کے بعد مسلسل کئی مقالات لکھ گئے

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استفادہ اور مدح سرائی میں حد افراط کو پہونچا ہوا ہوں جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائی، عطارؒ، اور عارف رومیؒ آداب شریعت کے پاس اور لحاظ، اور ظاہر و باطن کی یکرنگی اور دعوت و عمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے میں بعض پر جوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے

---

[۱] المسلمون شمارہ ۳ جلد ۶

سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر دور میں اس کا قائل رہا کہ وہ اسلامیات کے ایک مخلص طالب علم رہے اور اپنے مقتدر معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے،[۱]

ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم و فن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے اور جنھیں دور کرنے کا موقع انھیں نہیں ملا۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے مطابق بعض حِکَم و حقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے ۔ میرا خیال ہے کہ پیغام محمدی کے بقائے دوام، امت مسلمہ کے استحکام، اور اس کی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات و فلسفہ کی بے مائگی، پر ان کے پختہ عقیدہ سے......... ان کی فکر میں وضاحت اور پختگی آئی ہے اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے اس معاملے میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلاء سے بھی آگے ہیں جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انھیں اس کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔

آخر میں پھر کہتا ہوں کہ انھیں میں نے اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نوا خواں شاعر پایا۔ اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈنے لگا، اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ احساسات، و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں، اور رگوں میں شجاعتِ اسلامی کی رَو دوڑنے لگی۔ میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے۔

یہ کتاب عربی میں میں نے اسی لئے لکھی کہ مشرق اوسط میں مغربی فلسفہ و تہذیب کے حد سے بڑھے ہوئے اثرات میری نظر میں تھے اور میں دیکھتا تھا کہ عالم اسلامی و عربی کس طرح جاہلیت قدیمہ و جدیدہ

---

[۱] مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندوی کے نام خطوط میں ان کے اخلاق و تواضع اور علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

کے دوراہے پر آکھڑا ہوا ہے۔ جہاں ایک طرف حد سے بڑھی ہوئی قومیت ہے تو دوسری سمت اشتمالیت واشتراکیت، ـــــ اور ان دونوں کا اثر شعر وادب، سیاسی وتجارتی تعلقات آرٹ اور فنونِ لطیفہ تک میں نفوذ کر گیا ہے۔ لیکن وہاں ایسے اہل قلم نایاب ہوتے جا رہے ہیں جو عالم عربی کے پیغام کو سمجھتے اس کی مخلصانہ خدمت کرتے اور اپنی تمام فکری صلاحیتوں کو اس جاہلیت کے خلاف جنگ میں صرف کر دیتے جو آسمانی دعوتوں اور اخلاقی قدروں کے لئے پیام موت ہے جو اس فکری ارتداد کے خلاف صف آرا ہو جاتے جو تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے،

مغربی فکر کی اس مسموم اور گمدر فضا، اور اس دنیا کو (جو اپنی قیمت، وصلاحیت، اپنے پیغام اور دعوتی مقام سے بالکل غافل ہو چکی تھی) پیش نظر رکھتے ہوئے اس شاعر کی قیمت وعظمت یقیناً بہت بڑھ جاتی ہے جو گہوارۂ اسلام سے بہت دور، ایک نومسلم برہمن خاندان، اور ایسے ملک میں پیدا ہوتا ہے جہاں فرنگ اور فرنگی تہذیب کی حکومت ہو۔ وہ عصری اور مغربی علوم وفنون کے بڑے سے بڑے مرکزوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے مگر پیغام محمدی پر اس کا ایمان مضبوط ہی ہوتا چلا جاتا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور ان کی امت کی صلاحیت، اس کے مستقبل پر اعتماد بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور اسلامیت کی حمیت اور مغربی فلسفہ وتہذیب سے نفرت اس کی طبیعت بن جاتی ہے اور وہ اپنی تمام فنی صلاحیتوں کو اپنی فکر وعقیدہ کی راہ میں لگا دیتا ہے اور صاحب ایمان شاعری، داعیانہ نظر اور فلسفیانہ پختہ کاری کی علامت بن جاتا ہے اور اپنے افکار کی ضرب سے برصغیر کے بحر منجمد میں ایک شورش وطوفان پیدا کر دیتا ہے جس کی لہریں بحر ہند سے گزر کر ساحل عرب اور عالم اسلام کی سرزمین سے ٹکراتی ہیں ـــــــ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہی وہ بہترین فکری ہدیہ ہے جو ہم اسلام کی نئی نسل اور اٹھتے اور ابھرتے ہوئے جوانانِ عرب کو دے سکتے ہیں۔ میں یہ کتاب پیش کرتے ہوئے امیدوار ہوں کہ شاید اس سے عزم وارادہ کو حرکت میں لانے، طبیعتوں

کا جمود توڑنے، سوئی ہوئی غیرت وحمیت کو جگانے کا کوئی سامان اور فکر وادب کو نیا موڑ دینے کا کوئی رجحان ضرور پیدا ہوگا۔

واللہ من وراء القصد

شاعرِ اسلام اقبالؒ ——— حیات و خدمات

اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے ان کا خاندان کشمیری برہمنوں کا خاندان تھا ان کے جد اعلیٰ دو سو سال قبل اسلام لائے تھے اور اسی وقت سے صلاح وتقویٰ کا رنگ خاندان میں قائم رہا خود اقبال کے والد ایک صوفی صافی انسان تھے۔

اقبال کی انگریزی تعلیم اپنے شہر کے اسکول میں ہوئی جہاں کا امتحان امتیاز سے پاس کرکے وہ شہر کے کالج میں پڑھنے لگے جہاں سید میر حسن ایسے کامل استاد سے سابقہ پڑا جو اپنے تلامذہ میں اپنا رنگ اور علمی ذوق پیدا کر دینے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اقبال بھی ان سے متاثر ہو کر علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور آخر عمر تک ان کا احسان نہ بھلا سکے۔

سیالکوٹ سے لاہور جا کر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل لیا اور فلسفہ، عربی اور انگریزی مضامین اختیار کرکے بی اے کی سند لی۔ وہیں مسٹر آرنلڈ سر شیخ عبدالقادر (مدیر مخزن) سے متعارف ہوئے،

۱۹۰۱ء میں اقبال کی نظم "چاند" اور دوسری نظمیں "مخزن" میں شائع ہوئیں جو ادبی حلقوں میں ایک نئی آواز سمجھی گئیں اور نوجوان شاعر کی طرف تحسین کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔

اسی عرصے میں اقبال نے فلسفہ میں امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کیا اور تاریخ، فلسفہ، وسیاسیات کے لکچرر کی حیثیت سے اورینٹل کالج لاہور میں ان کا تقرر ہوا پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے استاد مقرر ہوئے، جہاں طلبہ اور اساتذہ نے ان کی علمیت و فضیلت کا لوہا مان لیا اور انھوں نے محکمہ تعلیم کے ذمہ داروں کا اعتماد حاصل کیا۔

وہ ۱۹۰۵ء میں کیمبرج میں داخل ہوئے اور فلسفہ و معاشیات کی امتیازی ڈگریاں پاکر تین سال تک لندن میں قیام پزیر رہے اور اس عرصے میں اسلامی موضوعات پر خطبات و مقالات کا سلسلہ بھی جاری رہا جس سے ان کی شہرت و مقبولیت علمی حلقوں میں پھیلی اسی مدت میں پروفیسر آرنلڈ کی غیر موجودگی میں لندن یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے اور میونخ جاکر فلسفہ میں ڈاکٹریٹ حاصل کی اور پھر لندن آکر قانون کا اعلیٰ امتحان پاس کرکے کامرس کالج لندن میں استاد ہوگئے۔ اور پھر سیاسیات و اقتصادیات میں امتیاز پیدا کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں عازمِ وطن ہوئے اقبال جب سسلی سے گزرے تو اشک حسرت سے سیراب کرتے ہوئے گزرے:

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

یہ سارے امتیازات اقبال کو کل ۳۲، ۳۳ سال کی عمر ہی میں حاصل ہوئے۔ واپسی پر دوستوں اور قدردانوں نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا اقبال نے وکالت شروع کی لیکن سچ یہ ہے کہ وہ ان کو راس نہ آئی نہ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی ان کے اکثر اوقات غور و فکر، تصنیف یا سخن سنجی میں صرف ہوتے تھے۔ وہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔

اسی کے ایک جلسے میں انھوں نے 'شکوہ' اور دوسرے جلسہ میں جواب شکوہ پڑھی جو ایک قومی نظم کی حیثیت اختیار کر گئی اور جسے بے مثال قبولِ عام حاصل ہوا۔ اور یہ صحیح بھی ہے کہ زبان وبیان کے اعتبار سے وہ بہترین نظمیں تھیں۔

انھی دنوں آپ نے "ترانۂ ہندی اور ترانۂ ملی" لکھا دونوں ترانوں نے ضرب المثل شہرت ومقبولیت پائی اور دونوں قومی اور ملی محفلوں کے افتتاح کے لئے قومی ترانہ سمجھے جانے لگے۔[۱]

۱۹۱۰ء میں طرابلس وبلقان کی جنگوں نے اقبال پر اپنا شدید اثر ڈالا اور ان کے قلبی احساسات کو ایک کاری زخم لگا جس نے مغربی تہذیب اور یورپی سامراج سے شدید نفرت کی شکل اختیار کر لی ان کے رنج والم نے ان سے وہ پرجوش نظمیں کہلوائیں جو مسلمانوں کے غم میں گرم آنسو اور مغرب کے خلاف تیر ونشتر تھیں۔

بغاوت وانقلاب کی یہ روح ان کی اس زمانے کی تمام ہی نظموں میں جاری وساری ہے، بلاد اسلامیہ، وطنیت، نے ہلال عید، مسلم، فاطمہ بنت عبداللہ (جو جہاد طرابلس ومحاصرۂ اورنہ میں شہید ہوئی) صدیقؓ، بلالؓ، تہذیب حاضر، دین، اور حضور رسالت مآب میں ان نظموں میں انھوں نے مسلمانوں کے ان قائدین وزعماء کے رویّے پر افسوس ظاہر کیا ہے جو اسلامی قیادت کے دعویدار ہیں مگر حضرت رسالتمآبؐ سے انھیں کوئی قلبی اور روحانی رابطہ نہیں وہ کہتے ہیں کہ میں ان تمام لیڈروں سے بری ہوں جو یورپ کے لئے شدرحال تو کرتے ہیں لیکن وہ آپؐ سے نہ آشنا ہیں نہ کسی گہرے تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔

---

[۱] جواہر لال نہرو کے بارے میں سننے میں آیا کہ وہ اسے قومی ترانہ بنانا چاہتے تھے لیکن تقسیم ہند کے بعد اقبال بدقسمتی سے پاکستان کے اور ٹیگور ہندوستان کے قومی شاعر سمجھے جانے لگے اور ٹیگور کا ترانہ قومی ترانہ بنا۔

(مترجم)

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا

کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائرین حریم مغرب، ہزار رہبر بنیں ہمارے

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

شاعر عالم خیال میں بارگاہ رسالت میں حاضری دیتا ہے تو حضور رسالتمآب سوال فرماتے ہیں ہمارے لئے کیا ہدیہ لائے ہو شاعر نے جو نذرانہ پیش خدمت کیا وہ اس کے شعروں سے ظاہر ہے

نکل کے باغ جہاں سے برنگِ بو آیا — ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں!

پھر اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں جب یورپ میں جنگ عظیم کا لاوا پھوٹا اور عالم اسلام پر جو حالات و حوادث گزرے انھوں نے انکو دردمند شاعر مجاہد داعی، فلسفی حکم اور دیدہ ور مبصر بنا دیا جو حالات سے مستقبل کا اندازہ لگا لیتا اور پیشگوئی کرتا اور حقائق و عبر کو نظم کا لباس پہناتا، اپنی آتش نوائی اور شعلہ نفسی سے ایمان و یقین، خودی اور بے جگری کی آگ بھڑکاتا۔

اس زمانے میں ان کے سینے کا جوش، دل کا فیضان، اور طبیعت کا سیلان اپنے عروج پر تھا، اس وقت انھوں نے جو نظمیں کہیں ان میں "خضر راہ" گل سرسبد کا حکم رکھتی ہے جس کا ہر قطعہ شعر و ادب، دروں بینی اور حقیقت شناسی کا شاہکار ہے، لیکن طلوع اسلام، بیت الغزل کا حکم رکھتا ہے جسکی مثال اسلامی ادب میں مشکل سے کہیں اور مل سکے گی۔

بانگ درا، ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آئی اور جب سے اب تک اردو کے افق پر اس کا ستارہ غروب نہیں ہوا نہ اس کی آواز صدائے صحرا۔ اس کی اشاعت کے بعد کا دور ان کی وفات تک فکری پختگی

دائرہ علم کی وسعت وبیکرانی کے لئے مشہور ہے اسی دور میں ان کے نصب العین اور دعوت وپیغام میں وضاحت وقطعیت پیدا ہوئی۔ اوران کے فارسی مجموعۂ کلام سامنے آئے۔

انھوں نے فارسی کو اپنے اظہار خیال کے لئے اس لئے ترجیح دی کہ اردو کے مقابلے میں اس کا دائرہ وسیع تھا اور عربی کے بعد عالم اسلامی کی وہ دوسری زبان کا درجہ رکھتی تھی، ایران و افغانستان کی تو وہ مادری زبان ہی تھی اوراب بھی ہند وبیرون ہند میں اس کے ذوق آشنا بہت ہیں اوراس کا اثر ترکستان، روس اور ترکی تک پھیلا ہوا ہے اس دور میں ان کے اردو مجموعوں کے علاوہ فارسی میں اسرار خودی ورموز بیخودی، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، مسافر شائع ہوئیں مدراس لکچرز (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) اور کیمبرج کے لکچر اس کے بعد شائع ہوئے جن پر

اورارباب مذہب وفلسفہ نے یکساں طور پر توجہ کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اورمتعدد زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوا۔ نکلسن نے اسرار رموز کا انگریزی ترجمہ کیا اور جرمنی واطالیہ میں ان کے شعر وپیام پر غور وفکر کے لئے ان کے نام سے اکیڈمیاں قائم ہوئیں، ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے پہلی بار پاکستان کا نظریہ پیش کیا اور پنجاب کے مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے اور ۳۱-۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کی لندن میں انھیں فرانس اسپین اور اٹلی کی حکومتوں نے ملکی دورے کی دعوت چنانچہ آپ موخر الذکر دونوں ملکوں کی دعوت پر گئے اور میڈریڈ میں 'اسلامی آرٹ پر چند خطبات دیئے۔ مسلمانوں کی صدیوں کی جلاوطنی کے بعد مسجد قرطبہ میں پہلی بار نماز پڑھی اور عربوں کی ۸سو سالہ حکومتؒ اوران کے اقبال رفتہ کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روئے اور دل کے پھپھولے پھوڑے اقبال نے اپنی نظم میں اپنے احساسات اور سچے جذبات کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جس میں اسلامی اندلس کی تہذیبی روح، اوراس کے ماضی کا عطر کھنچ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہوں کے سامنے عظمت رفتہ کی تمام تصویریں آکھڑی ہوئی ہیں مسجد قرطبہ اپنی ویرانی

کی فریاد کر رہی اور نمازیوں کے سجدۂ پرشوق کو ترس رہی ہے، قرطبہ کی فضائیں اذان کی صداؤں کے لئے گوش برآواز ہیں اور اندلس عہد اسلامی کی یاد میں اب تک سوگوار ہے اس نظم میں اقبال کے فکرو فن اپنی معراج پر ہیں اور وہ عالمی ادبیات عالیہ میں شمار ہونے کے لائق ہے، اسپین میں اقبال کا پرجوش استقبال ہوا تھا اسی طرح اٹلی میں بھی موسولینی نے ان کی پزیرائی کی جوان کی کتابیں پڑھے ہوئے اور ان کے فلسفہ سے واقف تھا اس لئے دیر تک آپس میں گفتگو ہوتی رہی۔

حکومت فرانس نے ان کو شمالی افریقہ کی مستعمرات کی سیر اور پیرس یونیورسٹی آنے کی دعوت دی لیکن غیرت مند مسلمان شاعر نے دعوت کو یہ کہہ ٹھکرا دیا کہ "یہ تو دمشق کی دردناک تباہی کی حقیر قیمت ہے"۔

یورپ کے دورانِ قیام ان کے دوستوں اور قدر دانوں نے کیمبرج، روم، سوربون، میڈرڈ یونیورسٹی اور رومن رائل سوسائٹی نے ان کے اعزاز میں جلسے کئے۔ واپسی میں آپ بیت المقدس کی موتمر اسلامی میں شریک ہوئے اور اثنائے راہ میں اپنی پر اثر نظم "ذوق وشوق" کہی،

۱۹۳۲ء میں شاہ نادر خاں شہیدؒ کی دعوت پر اس علمی وفد کے ساتھ افغانستان گئے جس میں سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی شریک تھے۔ بادشاہ نے بہت اخلاص کے ساتھ رازدارانہ گفتگو کی اور اپنا دل کھول کر رکھ دیا، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دیر تک گفتگو کرتے اور روتے رہے، سلطان محمود غزنویؒ اور حکیم سنائیؒ کے مزار پر پہنچ کر ان کا جذبۂ بے اختیار پھر اشک حسرت کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے نظم کا لباس پہنا۔ اس سفر کے تاثرات "مسافر" میں جھلکتے ہیں۔

اقبال عرصے سے طرح طرح کے امراض وعوارض کا شکار چلے آرہے تھے بالآخر ان کی صحت نے جواب دیدیا اور وہ صاحب فراش ہوگئے لیکن اس حال میں بھی شعر گوئی، تصانیف اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ان دنوں کے مشاغل میں قومیت کے نظریہ کی تردید ان کی تحریروں کا بہت نمایاں حصہ

ہے انہی دنوں آپ نے یہ قطعہ کہا تھا،

بہشتے بہر پاکانِ حرم ہست بہشتے بہر اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

اور اپنی وفات سے ۔ امنٹ پہلے وہ قطعہ کہا جو شوق و حسرت کا بیان اور ان کی زندگی کا ترجمان ہے:

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید!
سر آمد روزگار این فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید!

اور پھر اپنا آخری لاثانی شعر کہا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست!

یہ آخری دلیل تھی جو انھوں نے صداقت اسلام، اور مومن کے ایمان و یقین پر قائم کی اور اپنے بوڑھے وفادار خادم کی گود میں آخری سانس لی۔ اور عالم اسلامی میں پھیلے ہوئے دوستوں، شاگردوں اور قدردانوں سے منھ موڑ کر اور ان کو سوگوار چھوڑ کر دین و ادب کا آفتابِ عظمت و اقبال جس نے دلوں کو حرکت و حرارت روشنی اور گرمی عطا کی تھی ۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کا آفتاب نکلنے سے پہلے غروب ہو گیا۔[1]

---

[1] یہ مقالہ ۱۹۵۱ء کو سعودی ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔

اقبالؔ کی شخصیت کے تخلیقی عناصر

اقبالؔ کی شخصیت کے وہ تخلیقی عناصر جس نے اقبال میں ایک مخصوص قسم کی گوناگونی، رنگارنگی پیدا کردی، اور جس نے اقبال کو اس کے ہم عصروں سے زیادہ دل آویز، باعثِ کشش اور جاذبِ نظر بنادیا چند ایسے عناصر ہیں جن کا تعلق اقبال کی علمی وادبی اور تعلیمی کوششوں سے بہت ہی کم ہے اقبال کی شخصیت میں جو جامعیت، بلندیٔ فکروخیال، سوز، درد، کشش اور جاذبیت نظر آتی ہے، ان کا تعلق اقبال کی زندگی کے اس رُخ سے ہے، جسے ہم یقین وایمان کہتے ہیں۔

دراصل اقبال کی شخصیت کے بنانے، سنوارنے اور پروان چڑھانے میں عصرِ حاضر کے صرف ان تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کا ہاتھ نہیں ہے، جن میں کہ اقبال نے داخل ہوکر علومِ عصریہ اور مغربی تعلیم حاصل کی۔ گرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال علومِ جدیدہ اور مغربی تعلیم کا حصول ہندوستان انگلستان اور جرمنی میں ماہر اساتذہ سے کرتے رہے، اور وہاں کے علم وفن کے چشموں سے سیراب ہوتے

رہے، یہاں تک کہ وہ عالمِ اسلامی میں مغربی علوم وافکار اور تہذیب وتمدن کے ماہرین میں منفرد شخصیت کے مالک ہوگئے۔ مغربی فلسفہ، واجتماع، اخلاق اور سیاست ومعیشت میں یورپ کے ایک متخصص کی حیثیت حاصل کی، اور علومِ جدید وقدیم میں بڑی گہری نگاہ حاصل کی۔ لیکن اگر اقبال اس مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتے اور موجودہ تعلیمی اداروں کے پھلوں سے استفادہ کے بعد مطمئن ہو کر صرف اس حلاوت ومزہ سے لطف اندوز ہوتے رہتے تو پھر آج وہ ہمارے موضوعِ گفتگو نہیں بن سکتے تھے، اور نہ ادبِ اسلامی اور تاریخِ ادب اسلامی ان کے شعر وادب کے نغموں سے گونجتی رہتیں، اور نہ علمی صدارت، فکری زعامت اور اسلامی ذہانت ان کے لئے اپنا دامن وسیع، اور نہ انھیں اس بلند مقام پر بٹھا کر فخر محسوس کرتیں اس کے لئے بڑی باریک اور بلند شرطیں ہیں کوئی شخص محض درس وتدریس، علوم میں تنوع اور کثرتِ تالیف وتصنیف کی وجہ سے اس مقام بلند تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ اقبال اگر ان تعلیمی اداروں سے استفادہ کے بعد مطمئن ہو جاتے اور انھیں علوم وفنون کی علمی موشگافیوں میں اپنی دلچسپیوں کو محدود رکھتے تو زیادہ سے زیادہ فلسفہ، معاشیات، ادب اور تاریخ میں ایک ماہر استاذ اور پروفیسر کی جگہ اختیار کرتے، یا ایک بڑے پایہ کے مصنف، علومِ عصریہ کے ماہر فن، صاحب اسلوب ادیب یا ایک اچھے شاعر ہوتے، اور بس! یا پھر ایک کامیاب بیرسٹر، ایک اچھے جج، یا حکومت کے ایک اچھے وزیر بنائے جاتے، لیکن آپ یقین کیجئے اگر اقبال ان میں سے کچھ بھی ہوتے تو زمانہ انھیں ویسے ہی بھلا دیتا جس طرح دنیا کے ان بڑے بڑے علماء، ادباء، شعراء، مصنفین، اور حکومتوں کے وزراء کو آج زمانے نے گوشۂ عزلت وگمنامی میں ڈال رکھا ہے اور آج کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے؟ اور کیا تھے؟ لیکن اقبال کی ذہانت وعبقریت، ان کا زندۂ جاوید پیغام اور ان کی ذہنوں اور دلوں کی تسخیر کرنے کی طاقت وکشش ——— ان تمام فضائل اور بلندیوں کا سبب ان دنیاوی تعلیمی اداروں سے جدا، ایک دوسرا تعلیمی ادارہ ہے جس میں کہ اقبال نے تعلیم وتربیت حاصل کی

بڑھے اور پروان چڑھے۔

میرا خیال ہے کہ آپ میں سے اکثر کا ذہن اس مخصوص "ادارہ" کی تلاش وجستجو میں پریشان ہوگا، اور آپ اس کے جاننے کے لئے بے چین ہوں گے کہ آخر وہ کون سا ادارہ ہے جس نے اس "عظیم شاعر" کو پیدا کیا؟ اور وہ کون سے علوم ہیں جو اس میں پڑھائے جاتے ہیں؟ کس زبان میں وہاں تعلیم ہوتی ہے؟ اور کیسے معلّم وہاں تعلیم دیتے ہیں؟ بلاشبہ اس میں اعلیٰ درجے کے نگران اور مربّی ہیں جو ایسی ہی عظیم شخصیتیں پیدا کرتے ہیں (جیسے کہ اقبال تھے) مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اسکے وجود اور محل ومقام سے واقف ہو جائیں تو پھر ضرور اس میں داخلہ کی کوشش کریں اور اپنی تعلیم وتربیت کے لئے اپنے آپ کو اس بے نظیر وبے مثال ادارہ کے سپرد کردیں۔

وہ ایک ایسا "ادارہ" ہے کہ جس نے اس میں تعلیم وتربیت حاصل کی، اس کی ناکامی کا کوئی سوال نہیں، جو وہاں سے نکلا وہ ضائع نہیں ہوسکتا، وہ ایک ایسا ادارہ ہے کہ جہاں سے صرف ائمۂ فن، مجتہدینِ فکر، واضعینِ علوم، قائدینِ فکر واصلاح، اور مجدّدینِ اُمت ہی پیدا ہوتے ہیں، وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کے سمجھنے میں عام مدارس ویونیورسٹیوں کے طلباء واساتذہ مشغول رہتے ہیں، ان کی لکھی ہوئی چیزیں درس کے طور پر پڑھی پڑھائی جاتی ہیں، ان کے تصنیفوں کی شرحیں لکھی جاتی ہیں، ان کے اجمال کی تفصیل کی جاتی ہے، ان کے ثابت شدہ نظریات کی تائید وتشریح ہوتی ہے، ان کے ایک ایک لفظ پر کتابیں لکھی جاتی ہیں، اور ان کی ایک ایک کتاب سے پورا پورا کتاب خانہ تیار ہوجاتا ہے وہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں تاریخ پڑھائی نہیں جاتی بلکہ تاریخ بنائی جاتی ہے، وہاں افکار ونظریات کی تشریح وتوضیح نہیں ہوتی بلکہ افکار ونظریات وضع کئے جاتے ہیں، آثار ونشانات کے کھوج نہیں لگائے جاتے بلکہ وہاں سے آثار ونشانات پیدا ہوتے ہیں، یہ ادارہ اور مدرسہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا ہے، یہ دراصل ایک داخلی مدرسہ ہے جو ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور ہر انسان اسے

اٹھائے ہر مقام پر لئے پھرتا ہے، وہ دل کا مدرسہ اور ضمیر و وجدان کا ادارہ ہے وہ ایک ایسا مدرسہ ہے جہاں روحانی قوت اور آگہی تربیت ہوتی ہے،

اقبال نے اس ادارہ سے اسی طرح تکمیل کی جس طرح دوسرے بہت سے وہبی انسان اس عظیم ادارہ سے تعلیم و تربیت کے بعد نکلے اقبال کی سیرت و شخصیت اس کا علم و فضل اور اخلاق، یہ سب کا سب مرہونِ منت ہے اسی قلبی ادارہ کا جس میں کہ اقبال نے برسوں زانوِ تلمذ تہ کیا ہے اقبال کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کی اچھی نشاندہی کرتا ہے کہ خارجی مدرسہ کی بہ نسبت داخلی مدرسہ نے اس کی زندگی میں ایک درد و سوز، تب و تاب اور ایک نئی قوت و توانائی بخشی۔ اگر وہ اپنے داخلی مدرسہ میں تعلیم و تربیت حاصل نہیں کرتا تو پھر نہ اس کی یہ جاذبِ نظر شخصیت ہی ظاہر ہوتی، اور نہ اس کا شعور و وجدان اس قدر شعلہ تپاں نظر آتا، اور نہ اس کا آتشیں پیام قلب و نظر کے لئے سوزِ جاوداں ثابت ہوتا، اقبال کے کلام میں اس ادارہ کے اساتذہ و معلّمین اور مربّین کا ذکر و اعتراف بہت ہی کثرت سے ملتا ہے۔

وہ تخلیقی عناصر جنھوں نے اقبال کی شخصیت کو بنایا، بڑھایا اور پروان چڑھایا وہ دراصل اقبال کو اپنے داخلی مدرسہ میں حاصل ہوئے، یہ پانچ تخلیقی عناصر ہیں جنھوں نے اقبال کی شخصیت کو "زندۂ جاوید" بنا دیا،

ان میں سے پہلا عنصر جو اقبال کو اپنے داخلی مدرسہ میں داخلہ کے بعد اوّل ہی دن حاصل ہوا وہ اس کا "ایمان و یقین" ہے۔ یہی یقین اقبال کا سب سے پہلا مربّی اور مرشد ہے، اور یہی اسکی طاقت و قوت اور حکمت و فراست کا منبع اور سرچشمہ ہے لیکن اقبال کا وہ یقین و ایمان اس خشک جامد ایمان کی طرح نہیں ہے جو بے جان تصدیق یا محض جامد عقیدہ ہے۔ بلکہ اقبال کا "یقین" عقیدۂ و محبت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو اس کے قلب و وجدان، اس کی عقل و فکر، اس کے ارادۂ و تصرفات

اس کی دوستی و دشمنی، غرضیکہ اس کی ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلام اور اسکے پیغام کے بارے میں نہایت شدید الایمان تھے۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی محبت، شفقت اور ان کا اخلاص انتہا درجہ کا تھا۔ اس لئے ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندۂ جاوید دین ہے کہ اس کی بغیر انسانیت فلاح و سعادت کے بامِ عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم رشد و ہدایت کے آخری مینار، نبوت و رسالت کے خاتم اور مولائے کل ہیں:

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

اس دورِ مادیت اور مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک سے اقبال کی آنکھیں خیرہ نہ ہو سکیں، حالانکہ اقبال نے جلوۂ دانش فرنگ میں زندگی کے ایک طویل ایام گذارے، اس کی وجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اقبال کی وہی والہانہ محبت، جذبۂ عشق اور روحانی اتصال تھا، اور بلا شبہ ایک حبِ صادق اور عشقِ حقیقی ہی قلب و نظر کے لئے ایک اچھا محافظ اور پاسبان بن سکتا ہے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ　　سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں　　کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

رہے ہیں، اور ہیں، فرعون میری گھات میں اب تک　　مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں　　کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را

علامہ اقبال نے اپنی کتاب "اسرارِ خودی" میں ملتِ اسلامیہ کی زندگی کی بنیادوں اور ان ستونوں کے ذکر کے سلسلہ میں، جس پر حیاتِ ملتِ اسلامیہ موقوف ہے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

اپنے روحانی تعلق، دائمی اتصال اور اپنی فداکارانہ محبت کا بھی ذکر کیا ہے۔ جب وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا شعری وجدان جوش مارنے لگتا ہے اور مدحیہ اشعار ابلنے لگتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے محبت و عقیدت کے چشمے پھوٹ پڑے ہوں۔ اس سلسلہ میں چند اشعار پیش خدمت ہیں جن سے اقبال کے محبت بھرے جذبات کا قدرے اندازہ ہوگا:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشمِ اُو محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم

وقتِ ہیجا تیغِ اَو آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز

در دعائے نصرت آمیں تیغِ اُو
قاطعِ نسلِ سلاطین تیغِ اُو

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ اُمِ گیتی نزاد

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

در مصافے پیشِ آں گردوں سریر
دخترِ سردارِ طےؔ آمد اسیر

پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود
گردن از شرم و حیا خم کردہ بود

دخترک را چوں نبی بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ روئے او کشید

آں کہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
مکہ را پیغامِ لا تثریب داد

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشیم و یکیم

از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما

مست چشم ساقی بطحاستیم — درجہاں مثل مے و میناستیم
امتیازاتِ نسب راپاک سوخت — آتش او این خس وخاشاک سوخت
شورِ عشقش درنئے خاموشِ من — می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
من چہ گویم از تولائش کہ چیست — خشک چوبے در فراقِ او گریست
ہستیِ مسلم تجلّی گاہِ او — طورہا بالد زگردِ راہِ او

جوں جوں زندگی کے دن گذرتے گئے، اقبال کی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ محبت والفت بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ آخری عمر میں جب کبھی ان کی مجلس میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا یا مدینہ منورہ کا تذکرہ ہوتا، تو اقبال بے قرار ہو جاتے، آنکھیں بھر آتیں، یہاں تک کہ آنسو رواں ہو جاتے۔ یہی وہ گہری محبت تھی جو ان کی زبان سے الہامی شعروں کو جاری کر دیتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مکن رسوا حضورِ خواجہ مارا
حسابِ من زچشمِ او نہاں گیر

محبت وعقیدت کا، یہ شعر، کتنا اچھا مظہر ہے۔

دراصل علامہ اقبال کا یہی وہ ایمانِ کامل اور حبِّ صادق تھا جس نے اقبال کے کلام میں یہ جوش، یہ ولولہ، یہ سوز وگداز پیدا کر دیا۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائیگی کہ دراصل رقت انگیز شعر، عمیق فکر، روشن حکمت، بلند معنویت، نمایاں شجاعت، نادر شخصیت اور عبقریت کا حقیقی منبع وسرچشمہ محبت ویقین ہی ہے، اور تاریخِ عالم میں جو کچھ بھی انسانی کمالات یا دائمی آثار و نشانات نظر آتے ہیں وہ سب کے سب اسی محبت ویقین کے مرہونِ منت ہیں، اگر کوئی شخصیت یقین و محبت کے جذبہ سے خالی ہو تو پھر وہ صرف گوشت وپوست کی صورت ہے، اور اگر پوری امت اس سے خالی ہے

تو پھر اس کی وقعت بکریاں اَور بھیڑوں کے گلّے سے زیادہ نہیں۔ اور اسی طرح اگر کسی کلام میں یقین و محبت کی روح کارفرما نہیں ہے تو پھر وہ ایک مقفّیٰ اور موزوں کلام تو ہو سکتا ہے لیکن ایک زندہ جاوید کلام نہیں بن سکتا، اور جب کوئی کتاب اس روح سے خالی ہو تو اس کتاب کی حیثیت مجموعۂ اوراق سے زیادہ نہیں ہوگی اور اسی طرح اگر کسی عبادت میں محبت و یقین کا جذبہ شامل نہیں ہے تو پھر وہ ایک بے روح ڈھانچہ ہے بغرضکہ پوری زندگی اگر محبت و یقین کے جذبہ سے خالی ہے تو پھر وہ زندگی زندگی نہیں، بلکہ موت ہے، اور پھر ایسی زندگی کیا؟ جس میں طبعیتیں مردۂ و افسردہ ہوں، نظم و نثر کے سرچشمے خشک ہوں، اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہوں، ایسی حالت میں یقینِ کامل اور حبِ صادق ہی حیاتِ انسانی میں جلا پیدا کرتی ہے، اور انسانی زندگی نور و رنگ سے معمور ہو جاتی ہے، پھر شستہ، پرسوز و پردرد، روح نواز اور جاں بخش کلام سننے میں آتے ہیں، خارقِ عادت شجاعت و قوت دیکھنے میں آتی ہے، اور علم و ادب کے نقوش بھی زندۂ جاوید بن جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہی محبت اگر پانی، مٹی اور اینٹ، پتھر میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی زندۂ جاوید بنا دیتی ہے، ہمارے سامنے اس کی روشن مثال مسجد قرطبہ، قصرِ زہرا اور تاج محل ہیں، سچ تو یہ ہے کہ محبت و یقین کے بغیر اَدب و فن مردۂ و افسردہ و ناتمام ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

بڑی غلط فہمی میں وہ لوگ مبتلا ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ علم حضرات اپنی قوتِ علم، کثرتِ معلومات اور ذکاوت و ذہانت کی وجہ سے ایک دوسرے سے سبقت لیجاتے ہیں، یا ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اور اسی طرح شعرا کو ان کی فطری قوتِ شاعری، لفظوں کا حسنِ انتخاب، معانی کی بلاغت، انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے، اور مصلحین وقت اَور قائدین ملت کی بلندی و پستی موقوف ہے ان کی ذہانت کی تیزی، خطابت کی بلندی، سیاسی سوجھ بوجھ اور حکمتِ عملی پر! حالانکہ ایسا نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ

ان میں سے ہر ایک کی فضیلت و بلندی کا دار و مدار محبت و اخلاص پر ہے ان کی سچی محبت اور مقصد سے اخلاصِ کامل ہی ان کی عظمت و بزرگی کا سبب ہے اس لئے کہ اس کا مقصد و موضوع اور غرض و غایت اس کی روح میں سرایت کر جاتی ہے، قلب میں جاگزیں ہو جاتی ہے اور فکر و عمل پر چھا جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذاتی خواہش مغلوب اور شخصیت تحلیل ہو جاتی ہے، اب وہ جب کوئی بات کرتا ہے تو مقصد کی زبان سے کرتا ہے جب کچھ لکھتا ہے تو مقصد کے قلم سے لکھتا ہے، غرضیکہ اسکے فکر و خیال، دل و دماغ اور اس کی پوری زندگی پر اس کا مقصد چھا جاتا ہے۔

ایک عظیم گناہ جو اس جدید تمدن کا پیدا کردہ ہے، وہ ہے مادہ پرستی اور پھر اس سے نفع پسندی، جنسی محبت اور نفسانی خواہش! جو درحقیقت جدید عصری مادی تعلیم کا ثمرہ ہے، جس نے ہماری نئی نسلوں کو تباہ کر رکھا ہے، اور آج حال یہ ہے کہ ان کے قلوب، ایمان کی حرارت، حبِ صادق کی تپش اور یقین کے سوز سے خالی ہیں، اور یہ عالم نو ایک ایسی متحرک شے بن کر رہ گئی ہے کہ جس میں نہ کوئی زندگی ہے اور نہ کوئی روح، نہ شعور و وجدان ہے، نہ مسرت و غم کا احساس! اس کی مثال اس جامد شے کی طرح ہے جو کسی جابر و قاہر شخص کے دستِ تصرف میں ہو، وہ جس طرح چاہے اسے حرکت دے اور استعمال کرے۔

جب آپ اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اقبال کا کلام ہمارے جانے پہچانے شعراء سے بہت کچھ مختلف ہے، اقبال کا کلام ہمارے شعور و احساس، قلب و وجدان اور اعصاب میں حرکت و حرارت، سوز و گداز، درد و تپش پیدا کرتا ہے، اور پھر ایک ایسا شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں، فاسد معاشرہ اور باطل قدروں کے ڈھیر جل کر فنا ہو جاتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کس قدر طاقت ور ایمان، پر درد و پرسوز سینہ اور بے چین روح رکھتا ہے، قابلِ صد ستائش ہے وہ دوسرا مدرسہ جس نے اتنی اچھی تربیت کی اور ایسی قابلِ قدر شخصیت تیار کی۔

اقبال کی شخصیت کو بنانے والا دوسرا عنصر وہ ہے جو آج ہر مسلمان گھر میں موجود ہے، مگر افسوس کہ آج خود مسلمان اس کی روشنی سے محروم، اس کے علم و حکمت سے بے بہرہ ہیں، میری مراد اس سے قرآن مجید ہے اقبال کی زندگی پر یہ عظیم کتاب جس قدر اثر انداز ہوئی ہے، اتنا نہ وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی کتاب نے ان پر ایسا اثر ڈالا ہے۔ اقبال کا ایمان چونکہ "نو مسلم" کا سا ہے، خاندانی وراثت کے طور پر انھیں نہیں ملا ہے، اس لئے ان کے اندر نسلی مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن سے شغف، تعلق اور شعور و احساس کے ساتھ مطالعہ کا ذوق بہت زیادہ ہے، اقبال کا قرآن پڑھنا عام لوگوں کے پڑھنے سے بہت ہی مختلف رہا ہے، جیسا کہ خود اقبال نے اپنے قرآن مجید پڑھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کا یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ روزانہ بعد نماز صبح قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے، اقبال کے والد جب انھیں دیکھتے تو فرماتے کیا کر رہے ہو؟ اقبال جواب دیتے قرآن پڑھ رہا ہوں، کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا آخر ایک دن اقبال نے پوچھا، ابا جان! آپ مجھ سے روزانہ پوچھتے ہیں اور میں ایک ہی جواب دیتا ہوں اور پھر آپ خاموش چلے جاتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ جیسے قرآن اسی وقت تم پر نازل ہو رہا ہے اس کے بعد سے اقبال نے قرآن برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور اس طرح کہ گویا وہ واقعی ان پر نازل ہو رہا ہے اپنے ایک شعر میں بھی وہ اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

علامہ اقبال نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے گذاری، قرآن مجید پڑھتے، قرآن سوچتے، قرآن بولتے، قرآن مجید ان کی وہ محبوب کتاب تھی جس سے انھیں نئے نئے علوم کا انکشاف ہوتا، اس سے انھیں ایک نیا یقین، ایک نئی روشنی، اور ایک نئی قوت و توانائی حاصل ہوتی، جوں جوں ان کا مطالعۂ قرآن بڑھتا گیا، ان کے فکر میں بلندی اور ایمان میں زیادتی ہوتی گئی، اس لئے کہ قرآن ہی ایک ایسی

زندۂ جاوید کتاب ہے جو انسان کو لدنی علم اور ابدی سعادت سے بہرہ ور کرتی ہے، وہ ایک ایسی شاہ کلید ہے کہ حیات انسانی کے شعبوں میں سے جس شعبہ پر بھی اسے لگایئے، فوراً کھل جائے گا۔ وہ زندگی کا ایک واضح دستور اور ظلمتوں میں روشنی کا مینار ہے،

تیسرا عنصر جس کا اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے، وہ "عرفانِ نفس" اور "خودی" ہے علامہ اقبال نے عرفانِ ذات بہت زور دیا ہے۔ انسانی شخصیت کی حقیقی تعمیر ان کے نزدیک منت کشِ "خودی" ہے جب تک عرفانِ ذات نہ حاصل ہو اس اس وقت تک زندگی میں نہ سوز و مستی ہے اور نہ جذب و شوق!۔ اس سلسلہ میں اقبال کے یہ شعر ان کے فکر کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بَن، اپنا تو بَن

من کی دنیا؟ من کی دنیا، سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا، سود و سودا، مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا، نہ تن

ان کے کلام میں معنوی بلندی کے ساتھ ساتھ لفظوں کی بندش ہم آہنگی، اتار چڑھاؤ، روانی و تسلسل اور موسیقیت اس قدر زیادہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے،

علامہ اقبال کو خودی کی تربیت اور عرفانِ نفس پر بڑا اعتماد تھا، ان کے نزدیک خود شناسی و خود آگاہی انسان کو اسرارِ شہنشاہی سکھلاتے ہیں، عطار ہوں یا رومی، رازی ہوں یا غزالی بغیر عرفانِ نفس کے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی عرفانِ نفس کا نتیجہ تھا کہ اقبال نے اس رزق پر موت کو ترجیح دی جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو، اور دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اقبال کے خیال میں زیادہ بہتر ہے جس کی فقیری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خوبو اور ان کا اسوہ ہو، اور حق تو یہ ہے کہ عرفانِ نفس اور عرفانِ ذات ہی کے حصول کے بعد انسان جرأت سے اس بات کا اظہار کر سکتا ہے کہ:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اقبال کا تصورِ خودی خود اقبال میں اس قدر رچ بس گیا کہ ان کی زندگی عرفانِ نفس کا زندہ نمونہ تھی، ان کی زندگی کے اوراق میں ان کی خودی، خودداری، خود اعتمادی کے نقوش بہت ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں، عرفانِ نفس ہی کیلئے دوسروں کو مخاطب کرکے وہ اپنے آپ کو کہتے ہیں:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک — اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت — فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

بلاشبہ اقبال نے شکم کے مقابلے میں دل کو ترجیح دی، اور دل ہی کو اختیار کیا۔

یہ عرفانِ نفس ہی کا کرشمہ تھا جس نے اقبال کو ہر قسم کی فکری گمراہی اور ادبی بے راہ روی سے محفوظ رکھا، حالانکہ یہی دونوں چیزیں ہمارے عام ادبا و شعرا اور مصنفین کو ہر چراگاہ میں منھ مار لینے، ہر وادی میں بھٹکنے اور ہر موضوع پر لکھنے کو آمادہ کرتی ہیں، خواہ وہ ان کے عقیدہ و خیال کے موافق ہو یا نہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک نہ اپنی شخصیت کو پہچانتے ہیں، اور نہ اپنے پیغام سے واقف ہوتے ہیں لیکن اقبال نے اول ہی دن سے اپنی ذات اور شخصیت کو اچھی طرح پہچانا، اپنی وہبی صلاحیتوں کا صحیح صحیح

اندازہ کیا، اور پھر اپنی فکری صلاحیتوں، شعری قوتوں کو مسلمانوں کی زندگی کے ابھارنے، ان میں روح و زندگی پیدا کرنے اور یقین وایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے میں صرف کیا، اور ان میں قوت وحریت اور سیادت وقیادت کا احساس دلایا۔ اقبال ایک فطری اور وہبی شاعر تھے، اگر وہ شاعر نہ بننے کی کوشش بھی کرتے تو کامیاب نہ ہوتے، شعر کہنے پر وہ مجبور تھے، ان کی شاعری رِستے ہوئے قلب، پرجوش و پرسوز دل، معانی کی معنویت اور الفاظ کی شوکت کی آئینہ دار تھی۔ وہ ایک قادر الکلام ماہرِ فن شاعر تھے، ان کے ہمعصر شعراء نہ صرف یہ کہ ان کی امامت اور کلام میں اعجاز کے قائل تھے، بلکہ زبان، تراکیب، معانی افکار، جدتِ تشبیہ ہر چیز سے متاثر تھے۔ ان کی شاعری کو عظیم بنانے میں انگریزی اور جرمن شعر وادب اور فارسی شاعری کا بھی بڑا دخل ہے لیکن ان سب باتوں کے عرض کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقبال کے ہمعصروں میں کوئی اچھا اور اونچا شاعر ہی نہ تھا، بلکہ اچھے سے اچھے اور اونچے سے اونچے ادیب وشاعر موجود تھے، جو اپنے الفاظ کی فصاحت معنی کی بلاغت، استعارہ وتشبیہ کی جدت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، لیکن جو چیز کہ اقبال کو اپنے ہمعصروں سے ممتاز کردیتی ہے، وہ ہے ان کی شاعرانہ عظمت، ادبی قوت، فنی ذہانت، جبلی عبقریت اور ان سب کے ساتھ ساتھ اسلام کا پیغام! اقبال نہ ملکی شاعر تھے اور نہ وطنی، اور نہ عام روحانی شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی شراب وشاہد کی مرہونِ منت تھی، اور نہ ان کی شاعری نِری حکمت وفلسفہ کی شاعری تھی انکے پاس اسلام کی دعوت اور قرآن کا پیغام تھا جس طرح ہوا کے جھونکے پھولوں کی خوشبو پھیلاتے ہیں اور جس طرح اس زمانے میں برقی لہروں سے پیغامات کے پہچانے کا کام لیا جاتا ہے، اسی طرح اقبال بھی اپنے اس پیغام کو شعر کی زبان میں کہتے تھے تاکہ ان کے پیغام کے لئے شعر، برقی لہروں کا کام دے۔ بلاشبہ اقبال کی شاعری نے خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی قوم کو بیدار کردیا اور ان کے دلوں میں ایمان ویقین کی چنگاری پیدا کردی، تو یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ اقبال نے اپنے آپ کو پہچانا اپنی وہبی شخصیت و قوت کا صحیح اندازہ کیا، اور ان کو اصل مقام پر استعمال کیا۔

اور وہ چوتھا عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کو بنایا، پروان چڑھایا، اور اس کی شاعری کو نئے معانی، افکار کی جولانی اور قوت تاثیر عطا کی، ان میں کتابوں کی درس وتدریس اور مطالعہ کے شوق وانہماک کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اقبال کی آہِ سحر گاہی اس کا اصل سرچشمہ ہے جب سارا عالم خواب غفلت میں پڑا سوتا رہتا اِس اخیر شب میں اقبال کا اٹھنا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا، پھر گڑگڑانا اور رونا یہی چیز تھی جو اس کی روح کو ایک نئی نشاط اس کے قلب کو ایک نئی روشنی اور اس کو ایک نئی فکری غذا عطا کرتی، پھر وہ ہر دن اپنے دوستوں اور پڑھنے والوں کے سامنے ایک نیا شعر پیش کرتا، جو انسانوں کو ایک نئی قوت، ایک نئی روشنی، اور ایک نئی زندگی عطا کرتا۔

اقبال کے نزدیک آہ سحر گاہی زندگی کا بہت ہی عزیز سرمایہ ہے، بڑے سے بڑے عالم و زاہد اور حکیم و مفکر اس سے مستغنی نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

عطارؔ ہو رومیؔ ہو رازیؔ ہو غزالیؔ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

اقبال صبح میں اٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے، سفر و حضر ہر مقام اور ہر کہیں ان کے لئے سحر خیزی ضروری تھی:

زمستانی ہَوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

اور صرف یہیں تک نہیں بلکہ اس کی تمنا بھی کرتے ہیں کہ خداوندا مجھ سے تو جو چاہے چھین لے لیکن لذتِ آہِ سحر گاہی سے مجھے محروم نہ کر:

نہ چھین لذتِ آہِ سحرگہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

یہی وجہ تھی کہ وہ جوانوں میں اپنی اس آہ و سوز، اور درد و تپش کو دیکھنے کی تمنا کرتے تھے، اور دعائیں کرتے کہ خداوندا یہ میرا سوزِ جگر اور میرا عشق و نظر آج کل کے مسلم نوجوانوں کو بخش دے:

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

اسی بات کو ایک دوسری نظم میں اس طرح فرماتے ہیں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — تو ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے دل سے نکلی ہوئی یہ دعائیں بے اثر نہیں گئیں اور آج سارے عالم اسلام میں خالص اسلامی فکر و نظر لئے، نوجوانوں کی ایک نئی نسل ابھر رہی ہے:

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

آخری مؤثر عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کی تخلیق میں اہم حصہ لیا ہے، وہ مولانا جلال الدین رومی کی "مثنوی معنوی" ہے۔ یہ کتاب مولانا رومی کی مشہور مثنوی ہے۔ جو فارسی زبان میں وجدانی تاثر اور اندرونی شدت کی بنا پر لکھی گئی ہے دراصل یونانی فلسفہ عقلیات مولانا رومی کے دور میں جس طرح چھا چکا تھا اور کلامی مباحث خشک فلسفیانہ موشگافیاں مسلمانوں کے ذہنوں، دینی مدرسوں اور علمی اداروں میں جس طرح سرایت کر چکی تھیں اس سے ہٹ کر کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر مولانا روم نے مثنوی لکھنی شروع کی جو اپنے اندر قوتِ حیات کے ساتھ ساتھ ادبی بلندی، معانی کی جدت، حکیمانہ مثالوں اور نکتوں کے بیش بہا خزینے سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کتاب نے اس دور سے لے کر آج تک ہزاروں انسانوں کو متاثر کیا ہے، ان کے قلب و نظر میں تبدیلی کی ہے، اسلامی کتب خانے میں اپنے انداز پر یہ

ایک بے نظیر و بے مثال کتاب ہے، اس دورِ جدید میں، جبکہ اقبال کو یورپ کے مادی و عقلی، بے روح و بے خدا افکار و خیالات پیش آئے، اور مادہ و روح کی کشمکش اپنے پورے عروج کے ساتھ سامنے آئی تو اس قلبی اضطراب اور فکری انتشار کے موقع پر اقبال نے مولانا روم کی مثنوی سے معاونت حاصل کی، اس کشمکش میں مولانا روم نے ان کو بہت کچھ سہارا دیا، یہاں تک کہ اقبال نے پیرِ روم کو اپنا کامل رہنما تسلیم کرلیا، اور صاف صاف اعلان کردیا کہ عقل و خرد کی ساری گتھیاں جسے یورپ کی مادیت نے اور الجھادیا ہے، ان کا حل صرف آتشِ رومی کے سوز میں پنہاں ہے، اور میری نگاہِ فکر اسی کے فیض سے روشن ہے اور آج یہ اسی کا احسان ہے کہ میرے چھوٹے سے سبو میں فکر و نظر کا ایک بحرِ ذخار پوشیدہ ہے:

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

مولانا رومؔ سے اپنی اس محبت و عقیدت کا اظہار اقبال نے بار بار کیا ہے اور انھیں ہمیشہ "پیرِ روم" کے نام سے یاد کرتے ہیں:

صحبتِ پیرِ روم نے مجھ پہ کیا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

اقبال اس بیسویں صدی کے خالص صنعتی و مادی دور میں پھر کسی "رومی" کے منتظر ہیں، ان کے نزدیک مادیت کا زنگ عشق کی بھٹی ہی میں صاف ہوسکتا ہے، اور اس کے لئے آتشِ رومی کی ضرورت ہے:

عہ پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر + کاروانِ عشق و مستی را امیر۔ اقبالؔ　　عہ یعنی مطالعہ مثنوی

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

لیکن اقبال مایوس نہیں ہیں بلکہ اپنے کشتِ ویراں سے بہت ہی پرامید ہیں:

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنے کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو، تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہی وہ پانچ عناصر ہیں جنھوں نے اقبال کی شخصیت کی تخلیق کی، اور یہ عناصر دراصل اسی دوسرے مدرسہ کے فیض و تربیت کے نتائج ہیں جس نے اقبال کو مضبوط عقیدہ، قوی ایمان، سلیم فکر اور بلند پیغام عطا کیا، اور جس نے اقبال کو "اقبال" بنایا۔

اقبال اور مغربی تہذیب و ثقافت

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم نوجوانوں میں مغربی تعلیم اور تربیت کا شوق ہوا جس کے نتیجے میں وہ یونیورسٹیوں کا رخ کرنے لگے اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ فاتح قوم کا خوف اور دہشت ان کے دل سے نکل گئی، علمی روابط بڑھے، ثقافتی تعلقات پیدا ہوئے اور مغربی تعلیم گاہوں میں مقیم رہ کر اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کی جانے لگی اور اس طرح مغربی ماہرین کی نگرانی میں انھوں نے مغرب کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا، اور مغربی زندگی کی ہر قدر کو پہچاننے کی کوشش کی۔

فلسفہ، شعر و ادب، اور دوسرے نظام فکر کے ذریعہ مغربی تہذیب کے اسرار و رموز اس کا مادہ پرستانہ مزاج، خود پسند قومیت، اور جابندارانہ وطینت کو بھی دیکھا مغربی تہذیب کے دوسرے کمزور پہلو افلاس اقدار اور تہذیب کے زوال کے آثار بھی ان کے سامنے آئے۔

انھیں ان تعمیری قدروں کا بھی خیال پیدا ہوا جن سے یہ تہذیب خالی تھی اور اس کے راہنما بھی ان سے غافل تھے، خرابی کی وہ تمام صورتیں ان کی نگاہ میں آئیں جو اس تہذیب کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھیں لیکن شروع سے وہ اس کے بنیادی عناصر اور اس کے خمیر میں موجود تھیں ——

اس ماحول میں ان لوگوں میں فکری بیداری اور کچھ سوچنے اور کام کرنے کا جو حوصلہ پیدا ہوا وہ قیام یورپ کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس ردِعمل کے لئے مغربی فکر و فلسفہ سے گہری واقفیت، جرأت مندانہ نقطۂ نظر، اور غیر تقلیدی ذہن کی ضرورت تھی،

ایمان کی دبی ہوئی چنگاری آخر جب بھڑکی تو جدید تعلیم یافتہ طبقے میں مغرب کی طرف سے مایوسی پیدا ہوئی اور گہری، صحیح اور جرأتمندانہ تنقید کی طاقت بیدار ہوئی جو مبالغہ اور واقعات وحقائق کے انکار سے خالی تھی،

اقبال ان باغی ناقدین کی صف اول میں تھے عالمِ اسلامی نے اس سو سال میں جدید طبقہ میں شاید ان سے بڑا کوئی دیدہ ور نہیں پیدا کیا بلکہ وہ عصرِ حاضر میں مشرق کے سب سے بڑے مفکر و فلسفی ہیں۔ ہم دوسرے تمام مشرقی فضلاء میں مغربی تہذیب پر اقبال کی طرح گہری نگاہ اور ان جیسا جرأتمندانہ تنقیدی نقطۂ نظر ڈھونڈھے سے بھی نہیں پا سکتے۔

اقبال نے فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں، اس کے دبتے ہوئے پہلوؤں اور اس عنصری فساد اور بگاڑ کو دیکھ لیا تھا جو اس کی سرشت اور اس کی طینت میں موجود تھے۔

انھوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ذہن کس طرح مذہب اور اخلاقی وروحانی اقدار کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے۔ انھوں نے فسادِ قلب و نظر کو اس تہذیب کی روح کی ناپاکی کا ثمر بتایا ہے جس نے اس سے قلب سلیم کی دولت چھین لی:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف　　　رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید

وہ کہتے ہیں کہ تہذیب کی رونق و بہار حکومتوں کی وسعت اور اقتدار کے باوجود اس تہذیب کے زیرِ سایہ دوامی بے چینی و اضطراب سے چھٹکارا نہیں، برق و بخارات اس کی پوری فضا پر دھند کی طرح چھا گئے ہیں، بجلی کی روشنی ضرور ہے لیکن اس سے کوئی فکری راہ روشن نہیں ہوتی اور نہ عالمِ غیب کی نورانیت کی اس میں کوئی جھلک ملتی ہے:

یہ عیشِ فراواں یہ حکومت یہ تجارت　　　دل سینۂ بے نور میں محروم تسلّی

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے　　　یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلّی

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ　　　شاید ہوں کلیسا کے یہودی متوَلّی (یورپ اور یہود)

اقبال نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ لادینی تہذیب کی اساس ہی دین و اخلاق کی دائمی دشمنی پر ہے اور ہر زمانے میں مادیت کے بتکدے میں نئے بت تراشنا اس کا محبوب مشغلہ ہے "مثنوی پس چہ باید کرد" میں فرماتے ہیں کہ یہ بے خدا تہذیب ہمیشہ اہلِ حق کے ساتھ برسرِ آزار رہی ہے یہ فتنۂ روزگار حرم میں لات و عزیٰ کے صنم کو جگہ دے کر ہمیشہ نئے نئے فتنے پیدا کرتا رہا ہے قلب اس کے سحر سے بے بصیرت اور روح سراب تشنگی سے ہلاک ہو کر رہ جاتی ہے اس سے دل کی تب و تاب ہی نہیں ختم ہوتی بلکہ قالب ہی اس سے خالی ہو جاتا ہے۔

یہ وہ دزدِ دلاور ہے جو دن دہاڑے ڈاکہ ڈالتا اور انسان کو بے روح اور بے قیمت بنا کر رکھ دیتا ہے،

لیکن از تہذیبِ لادینی گریز　　　زاں کہ او با اہلِ دل دارد ستیز

فتنہ ہا ایں فتنہ پرداز آورد　　　لات و عزّیٰ در حرم باز آورد

از فسونش دیدۂ دل نابصیر　　　روح از بے آبیِ او تشنہ میر

لذتِ بے تابی از دل می برد! بلکہ دل زیں پیکرِ گل می برد

کہنہ دزدے غارت او برملاست

لالہ می نالد کہ داغِ من کجاست [1]

وہ کہتے ہیں کہ اس تہذیب کا شعار انسانیت کی تباہی، اور نوع بشری کی ہلاکت اور اس کا پیشہ تجارت ہے مغربی تہذیب کے ہوتے دنیا میں امن واطمینان، پاک محبت، اور خالص خدا پرستی ممکن نہیں۔

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست چشمِ او ینظر بنوراللہ نیست!

او نداند از حلال واز حرام حکمتش خام است وکارش ناتمام

امتے بر امتے دیگر چرد دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

وہ اسی مثنوی میں مزید فرماتے ہیں کہ نئی تہذیب کا خاص نشانہ وہی انسان ہے جو اس کی گرمیٔ بازار کا سبب اور اس کی تجارت کا آلہ کار ہے یہ بلند معیار زندگی اور بڑھتے ہوئے مصارف ان چالاک یہودیوں کے مکر کی پیداوار ہیں جس نے بنی آدم کے دل سے حق کی روشنی چرائی ہے۔ عقل، تہذیب، اور دین و مذہب اس وقت تک محض خواب ہیں جب تک یہ موجودہ نظام سرے سے نہیں بدل دیا جاتا۔

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است پردۂ آدم دری سوداگری است

ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود نورِ حق از سینۂ آدم ربود!

تانہ وبالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

---

[1] پس چہ باید کرد - ۱۴

وہ فرماتے ہیں کہ تہذیب حاضر اپنی عمر کے لحاظ سے جوان ہے لیکن دراصل عالم نزع میں موت کی ہچکیاں لے رہی ہے،

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جوانمرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی!

اور اگر وہ اپنی طبعی موت نہیں مر سکتی تو اپنے ہی خنجر سے اپنا کام تمام کرے گی۔ شاخ نازک پر جو آشیانہ بنے گا وہ ضرور ناپائدار ہوگا۔ اس تہذیب کی اساس نہایت کمزور و ناستحکم ہے اس کی بلوریں دیواریں حالات و حوادث کے سنگین حملوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ یورپ کی سائنسی تحقیقات خود مغرب اور انسانیت کیلئے چیلنج بن گئی ہیں۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اسکا آشیانہ

اس دنیا سے ایک نئی دنیا نکلنے کے لئے بیقرار ہے، اور وہ پرانی دنیا (جسے فرنگیوں نے امن عالم اور عزتِ بنی آدم کو داؤں پر چڑھانے کے لئے قمار خانہ بنا رکھا تھا) آخری سانس لے رہی ہے،

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

یہ تہذیب اپنے اندر بڑی چمک دمک رکھتی ہے اور اس کا شعلۂ حیات بہت روشن ہے لیکن اس میں کوئی موسیٰ نہیں جو خدائی کلام والہام سے مشرف ہوتا اس میں کوئی ابراہیم بھی نہیں جو بت شکن بنتا اور آگ کو گلزار بنا دیتا۔

اس تہذیب میں عقل پروان چڑھتی ہے لیکن محبت اور انسانی جذبات اسی حساب سے

مرجھاتے اور دم توڑتے رہتے ہیں اس تہذیب کے بڑے انقلابی اور ترقی پسند بھی رسم وراہِ عام کی پابندی اور محدود دائروں کی حد بندی سے نہیں نکل سکتے اور ان کا انقلابی ذہن انقلاب میں تقلید پسند ہی رہتا ہے۔

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ　　جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
چشم مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار　　بادہ خوراں را نگاہ ساقی اش پیغمبر است
جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل　　عقل ناپروا متاع عشق را غارتگر است

در ہوایش گرمیٔ یک آہِ بے تابانہ نیست
رند ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست![1]

آدمیت زار نالید از فرنگ　　زندگی ہنگامہ بر چید از فرنگ
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد　　زیر گردوں رسمِ لادینی نہاد
مشکلات حضرت انساں از وست　　آدمیت را غمِ پنہاں از واست
در نگاہش آدمی آب و گل است　　کاروانِ زندگی بے منزل است

یورپ میں علم و ہنر کی روشنی تو بہت ہے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ بحر ظلمات چشمۂ حیواں نہیں رکھتا اسکی مادہ پرستی کا یہ حال ہے کہ رعنائی تعمیر، رونق اور حسن میں گرجوں کی عمارات سے بنکوں کی تعمیرات بڑھی ہوئی ہیں اس کی تجارت میں ایک کا نفع اور لاکھوں کی موت پوشیدہ ہے اور یہ علم و حکمت یہ سیاست و حکومت جس پر یورپ کو ناز ہے خالی خولی مظاہر ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں۔ مغربی قائدین بنی آدم کا خون پیتے ہیں اور اسٹیج پر آ کر انسانی مساوات اور عدالت اجتماعی کی تعلیم دیتے ہیں بیکاری عریانی، مے نوشی اور افلاس ہی فرنگی مدنیت کی سرفہرست فتوحات اور کارنامے ہیں جو قوم کہ فیضان سماوی سے محروم ہوتی ہے اس کے کمالات کی حد اور اس کا مبلغ علم برق و بخارات سے آگے

---

[1] پیام مشرق۔ ۲۴۸

نہیں ہوتا۔ جس تہذیب میں مشینوں کی حکومت ہو صنعت و حرفت ہی کی بادشاہی ہو اور انہی کا سکہ چلتا ہو اس میں دلوں کی موت، احساسِ مروت اور انسانی شرف و عزت کی ہلاکت یقینی ہے

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اسکے کمالات کی ہے برق و بخارات

مغرب پر تنقید و تجزیہ کے لئے ان کی کتاب "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں بہت سی تصریحات ملتی ہیں وہ مغرب کی مادی تہذیب اور اس کے پیدا کردہ مشکلات و مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حاصل کلام یہ کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد سے (دست و گریباں ہیں) اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور نا قابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لئے اسکی جد و جہد بتدریج ختم رہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اکتا چکا ہے اس کی نظر حقائق پر ہے یعنی جو اس کے اس سرچشمے پر جو اس کی آنکھوں کے

سامنے ہے لہذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے اور پھر جیسا کہ پہلے کو بھی خدشہ تھا اور جس کا بتاسف وہ اظہار بھی کر چکا ہے مادیات کی اس باقاعدہ نشو و نما نے اس کے رگ و پے بھی مفلوج کر دئے ہیں کچھ ایسی ہی حقیقت مشرق کی ہے۔

عصر حاضر کی لادینی اشتراکیت کا مطمح نظر بیشک نسبتہً زیادہ وسیع ہے اور اس کے جوش و سرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل کے مخالفین تبعین پر ہے لہذا وہ اس چیز ہی سے برسر پیکار ہے جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی۔ بہر حال یہ وطنیت ہو یا لادینی اشتراکیت دونوں مجبور ہیں کہ بحالت موجودہ انسانی روابط کی دنیا میں تطابق و توافق کی جو صورت ہے اس کے پیش نظر ہر کسی کو نفرت، بدگمانی اور غم و غصے پر اکسائیں۔ حالانکہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا جس میں باہمد گر مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ نہ اس تہذیب و تمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے؛[1]

اقبال مغربی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں حرکت اور ترقی بغیر

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۹۳۔۲۹۰

طبقاتی کشمکش اور وحشیانہ مقابلے کے ممکن نہیں۔ دینی اور سیاسی قدروں کی تفریق اور دین و دنیا کی علیحدگی کے تصور نے اس کی وحدت ختم کردی ہے وہ ہر صاحب نظر کی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو مادیت ہی کی دو شکلیں سمجھتے ہیں جس میں ایک مشرقی اور دوسری مغربی ہوتے ہوئے بھی مادیت اور محدود انسانیت کے نقطے پر مل جاتی ہیں، وہ جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانی کی زبان سے کہتے ہیں کہ "مغرب روحانی قدروں اور غیبی حقائق کو کھو کر روح کو معدے میں تلاش کر رہا ہے۔ حالانکہ روح کی قوت و حیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اشتراکیت کی نظر بطن و معدہ سے آگے جاتی ہی نہیں اور وہ حد سے حد مساواتِ شکم ہی تک سوچتی ہے۔۔۔۔ اخوت انسانی کی تعمیر مادی و معاشی مساوات پر ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے قلبی محبت انسانی اقدار اور معنوی و روحانی بنیادوں کی بھی ضرورت ہے۔

غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را

رنگ و بو از تن نہ گیرد جانِ پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است — بیخِ او در دل نہ در آب و گل است[1]

اسی طرح ملوکیت اور اشتراکیت مادی نقطۂ نظر، حرص و ہوس، اضطراب و انتشار خدا بے زاری، اور انسان کا استحصال کرنے کے نقطے پر آکر مل جاتی ہیں۔ زندگی اگر اشتراکیت میں "خروج" ہے تو ملوکیت میں "خراج" محروم انسان ان دو چکیوں کے درمیان بے بسی اور کس مپرسی کے عالم میں پستا اور کچلتا جا رہا ہے۔ اشتراکیت اگر علم و فن اور دین و اخلاق کی دشمن ہے تو ملوکیت عوام الناس کے خون کی پیاسی ہے اور امیر غریب دونوں کا خون چوستی ہے دونوں سراپا مادی

---

[1] جاوید نامہ۔ ۶۹

لذتوں میں غرق ہیں۔ ان کا جسم بہت تازہ اور روشن ہے لیکن ان کا قلب ظالم فاجر اور تاریک ہے۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را "خروج" آں را "خراج" — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست — آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن — در گلے تخمِ دلے انداختن[1]

مغربی تہذیب اور مسلم ممالک

اقبال کا پختہ عقیدہ ہے کہ مغربی تہذیب ممالک اسلامیہ کو ہرگز نجات نہیں دلا سکتی، نہ ان کے مسائل کو حل کر سکتی ہے نہ ان میں نئی زندگی کی کوئی روح پھونک سکتی ہے وہ کہتے ہیں کہ جو تہذیب اپنی موت آپ مر رہی ہے وہ دوسروں کو زندگی کب دے سکتی ہے، ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو — آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر — یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور[2]

مغرب نے ہمیشہ مشرقی ممالک کے احسان کا بدلہ احسان فراموشی اور کافر نعمتی سے، اور بھلائی کی جزا برائی سے دیا ہے۔ شام نے مغرب کو حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت دی جن کا پیام عفت و عصمت اور غم خواری و رحمت، برائی کے بدلے بھلائی، ظلم کے مقابلے پر عفو تھا لیکن مغرب نے شام پر اپنے قبضہ کے دوران خمر و قمار، بے پردگی اور آوارگی کے سوا کوئی تحفہ نہیں دیا:

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا — نبیٔ عفت و غم خواری و کم آزاری

---

[1] جاوید نامہ ۷۰ [2] ضرب کلیم ۶۸

صلۂ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے
مے وقمار و ہجوم زنانِ بازاری!

مشرق میں تجدد کے علمبرداروں پران کی تنقید

وہ اسلامی ممالک میں تحریک جدید (لیکن زیادہ صحیح الفاظ میں "مغربیت") کے علمبرداروں سے بدگمان نظر آتے ہیں اور یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ تجدید کی دعوت کہیں تقلید فرنگ کا بہانہ اور پردہ نہ ہو، کہتے ہیں:

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

وہ اس تحریک اصلاح و تجدید (مغربیت) کے علمبرداروں کی بے بضاعتی اور تہی مائگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے
کہ بزم خاوراں میں لیکے آئے ساتگیں خالی

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جنکی آستیں خالی

وہ دوسری تہذیب وافکار کی اندھی تقلید کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ہر قوم کے لئے عار کی بات ہے اور اس قوم کے لئے ناقابل معافی گناہ ہے جو قوموں کی قیادت اور عالمی انقلاب کے لئے پیدا کی گئی ہے کہتے ہیں:

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

وہ مشرق کی اسلامی اقوام کو ملامت کرتے ہیں جن کا منصب قیادت و امامت کا تھا لیکن وہ پست درجہ کی شاگردی اور ذلیل قسم کی نقالی کا کردار ادا کر رہی ہیں غالباً ترکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے ترکی میں کمالی اصلاح و انقلاب کی سطحیت اس کے کھوکھلے پن اور اس کے داعی و زعیم (کمال اتاترک) کی فکری کہنگی اور یورپ کی بے روح نقالی کی مذمت کھلے طریقہ پر کی ہے:

مصطفےٰ کو از تجدد می سرود	گفت نقش کہنہ را باید زدود!
نو نگردد کعبہ را رخت حیات	گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگ نو در چنگ نیست	تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ او را دمے دیگر نبود	در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لاجرم با عالم موجود ساخت	مثل موم از سوز عالم در گداخت

مغربی تعلیم اور اس کے اثرات

مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی GENOCIDE کے مرادف تھا عقلاء مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کیلئے جا بجا مراکز قائم کئے جنکو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم

کیا اکبر نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے ان کا مشہور شعر ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک دوسرے شعر میں انھوں نے مشرقی اور مغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس سے کئی برس بعد اقبال نے (جنھوں نے اس نظام تعلیم کا خود زخم کھایا تھا) اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا:

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ از وے روح قومے را تواں کشت

تعلیم جو قلب ماہیت کرتی ہے اور جس طرح ایک سانچہ توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے اس کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُدھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

وہ مغرب کے اس نظام تعلیم کو دین و مروت و اخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں جو مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ

لگا گرا ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل تک پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہ سے نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت، اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہوگیا اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیم اور فلسفہ کا مطلق اثر نہیں قبول کیا اور ان کا دینی فہم کتاب وسنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے[1]۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس آتش نمرود نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک انکو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ:

طلسم علم حاضر را شکستم، ربودم دانۂ و دامش گستم
خدا داند کہ مانند ابراہیم بنارِ او چہ بے پروا نشستم[2]

---

[1] اس کا اندازہ ان کے ان خطبات سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے مدراس میں دیئے تھے جس میں کہیں کہیں حقائق غیبی کی فلسفیانہ تعبیر اور تاویل کا شدید رنگ صاف جھلکتا ہے۔

[2] مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ۱۷۰–۱۶۸

اقبال اور عصری نظامِ تعلیم[1]

مغربی نظام تعلیم کی تنقید

اقبال نے جب اپنی بصیرت سے جدید نظام کا جائزہ لیا تو انھیں چند بہت بڑی کمزوریاں اور خامیاں نظر آئیں جنھیں انھوں نے اپنی تنقید اور صاف گوئی کا نشانہ بنایا اور ماہرین تعلیم کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی وہ جہاں مدرسہ اور طالب علم کے جرم کا ذکر کرتے ہیں وہاں اس سے مراد مغربی مدارس اور اس کے طلبہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نظام دانش نے نئی نسل کی حق میں سب سے بڑا جرم کیا ہے، وہ مدرسہ و خانقاہ دونوں سے بیزار نظر آتے ہیں جہاں نہ زندگی کی چہل پہل ہے نہ محبت کا جوش و خروش، نہ حکمت و بصیرت ہے نہ اپنے فکر و نظر:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ!

---

[1] یہ مقالہ قاہرہ یونیورسٹی (سابق جامعۃ الفواد الاول) میں ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۷۰ھ کو پڑھا گیا۔

وہ دانشکدوں کی کوزنگاہی وبے ذوقی اور خانقاہوں کی کم طلبی وبے توفیقی دونوں سے نالاں اور دونوں سے گریزاں ہیں:

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ ومردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو!

عصری دانشگاہوں کے جرائم

اقبال کی یہ سنجیدہ رائے ہے کہ تعلیم جدید نے نئی نسل کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت سے اعتنا اور قلب و روح کی نشوونما، روحانی ارتقاء، اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیۂ نفس سے غفلت کر کے اس پر سب سے بڑا ظلم کیا ہے۔ جس کے سبب اس کے قویٰ غیر متوازن، اور اس کی اٹھان غیر متناسب ہوئی ہے اور اس کی زندگی ہم آہنگی کے بجائے بے اعتدالیوں کا نمونہ بن گئی ہے، نئی نسل کے ظاہر و باطن، عقل و روح، علم و عقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے۔

اسکی عقل باریک مگر روح تاریک ہے اور اس کے ذہنی ارتقا کے ساتھ اس کا روحانی زوال بھی اسی حساب سے ہو رہا ہے وہ نئی نسل کو بہت قریب سے جانتے تھے اس لئے جب بھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے یا کوئی بات کہتے ہیں تو وہ واقعہ کی تصویر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل کا پیمانہ، خالی، اس کی روح پیاسی اور تاریک ہے مگر اس کا چہرہ بہت تازہ و بارونق اور اس کا ظاہر بہت چاق و چوبند ہے۔ اس کی عقل روشن مگر بصیرت اندھی ہے، بے یقینی اور یاس و قنوط ان کی زندگی کا حاصل اور محرومی ان کی قسمت ہے یہ نوجوان انسان نہیں انسانوں کی لاش ہیں وہ اپنی ذات کے منکر ہیں مگر دوسروں پر ایمان لاتے ہیں، اغیار و اجانب ان کے اسلامی خمیر سے دیر و کلیسا کی تعمیر کر رہے ہیں اور ان کی صلاحیتیں "صرفِ درِ میکدہ" ہو رہی ہیں، سخت کوشی اور جفاکشی کے بجائے

نرمی اور تن آسانی، لذت طلبی اور عیش کوشی ان کا مسلک بنتی جا رہی ہے۔

ان کی پست ہمتی کا یہ حال ہے کہ امیدیں اور آرزوئیں پیدا ہی نہیں ہوتیں یا پیدا ہوتے ہی گھٹ کے مر جاتی ہیں۔ نئی دانشگاہوں نے ان کے دینی جذبات کو پوری طرح سلا دیا اور ان کے وجود کو ہم نفسِ عدم بنا دیا ہے۔

اپنی ذات اور اپنی شخصیت سے ناواقفیت اور اپنی صلاحیتوں سے بے پروائی ان میں عام ہے مغربی تہذیب کے زیر اثر وہ اپنی روح کا سودا روٹی کے چند ٹکڑوں پر بھی کرتے اور ضمیر فروشی کر سکتے ہیں، ان کے معلم بھی ان کی قیمت اور حیثیتِ عرفی سے ناآشنا ہیں اس لئے انھوں نے انکو شرف و عظمت کے راز سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ مومن ہیں لیکن موت کی لذت سے بے خبر، اور توحید کی طاقت سے ناواقف وہ فرنگ سے تہذیب کے لات و منات کی درآمد کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے فرزند حرم ہو کر بھی ان کا دل "طوافِ کوئے ملامت" اور "سجدۂ پائے صنم" سے متنفر نہیں، فرنگ نے انھیں بغیر حرب و ضرب اور قتل و غارت کے بھی مار ڈالا ہے ان کی عقلیں بے جھجک" ان کے دل پتھر" اور نگاہ بیباک ہے ان کے قلوب بڑے سے بڑے حوادث کی چوٹ سے بھی نہیں پگھلتے ان کے علم و فن دین و سیاست عقل و دل سب کا مرکز مادہ ہے۔ ان کے دلوں میں افکار تازہ کی کوئی نمود نہیں ان کے خیالات میں کوئی بلندی نہیں ان کی زندگی پر جمود و تعطل کی برف جمی ہوئی ہے:

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

مکتبوں میں کہیں رعنائیٔ افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟

مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز
نصیبِ مدرسہ یا رب یہ آبِ آتشناک!

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا | دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک
آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں، | ساحرِ افرنگ کا صید زبوں
نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ | شستہ رو تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید | چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر ز خود مومن بغیر | خشت بند از خاک شاں معمار دیر

اقبال نئی نسل کے نوجوانوں سے کیا توقعات اور ان کے متعلق کیسے بلند خیالات رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے اشعار سے ہو سکتا ہے:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ایک قطعہ میں کہتے ہیں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے | پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے | مرا نورِ بصیرت عام کر دے!

"خطاب بہ جوانانِ اسلام" اور دوسری نظموں میں ان کی امیدوں اور آرزوؤں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، طلباء علی گڑھ کالج کے نام "عشق کے دردمند" نے اپنے پیغام میں صاف صاف کہا:

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

ان کی نظم "ایک نوجوان کے نام" میں ان کے احساسات بڑی وضاحت سے آ گئے ہیں:

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی | لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل | نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے انکو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ جب مسلم نوجوانوں کو اسلام کے بجائے دوسرے فلسفوں سے متاثر اور مرعوب دیکھتے ہیں تو فطری طور پر انھیں صدمہ ہوتا ہے اپنی نظم "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" میں کہتے ہیں:

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناری برگساں نہ ہوتا

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

دیں مسلک زندگی کی تقویم
دیں سرِ محمدؐ و براہیمؑ

دل در سخنِ محمدی بند
اے پور علیؓ ز بو علی چند!

چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قاید قرشیؓ بہ از بخاری!

اقبال نئی نسل کی بے ہمتی اور اس کی اخلاقی پستی کا ذمہ دار موجودہ نظام تعلیم کو قرار دیتے ہیں جس کے ہاں اخلاق پر کوئی زور نہیں اور نہ تربیت کا کچھ خیال ہے وہ کہتے ہیں کہ آجکل کے نوجوانوں کے دل سوز دروں سے خالی اور ان کی نظریں غیر عفیف ہیں، تعلیم یافتہ نوجوان کی زبان بہت تیز ہے لیکن اس کی آنکھوں میں اشک ندامت اور دل میں خوف و خشیت ذرا بھی نہیں،

جو آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

وہ ان سب باتوں کے لئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو مورد الزام قرار دیتے ہیں جنھوں نے نوجوانوں

کو اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے اور ان کی فطرت مسخ کر کے رکھدی ہے وہ دوسرا ذمہ دار حد سے بڑھی ہوئی "عقلیت" کو بھی سمجھتے ہیں جو اولوالعزمیوں اور پرخطر راہوں سے روکتی، اور ہر قدم پر مصلحت سنجی اور عاقبت بینی کا بہانہ تراشتی رہتی ہے۔

اقبال کی نگاہ میں اس ذہنی انحطاط کی ایک وجہ حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی اور اسباب طلبی، اور عہدوں، ملازمتوں اور اونچی کرسیوں کو تعلیم کا مقصد سمجھنا بھی ہے وہ کہتے ہیں کہ بے مقصد افراد کے لئے علم دوائے نافع نہیں سمِ قاتل و قاطع ہے اور ایسی رزق سے موت بہتر ہے

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مغربی تعلیم پر معاد کے بجائے معاش کا تصور جس طرح چھایا رہتا ہے وہ اس کے لئے جان لیوا ہے اس تعلیم کا یہ فیض ہے کہ مرغِ چمن محرومِ نوا اور فطرت بے رنگ ہو کر رہ جاتی ہے وہ روٹی بھی ہاتھ میں نہیں تھماتی اور دوسرے ہاتھ سے روح بھی قبض کر لیتی ہے:

نوا از سینۂ مرغِ چمن برد　　　زخونِ لالہ آں سوزِ کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی　　　کہ ناں در کف ندادو جاں زتن برد

جدید تعلیم کے مجرمانہ کردار کا اقبال نے بے باکی سے پردہ چاک کیا اور اس کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔ حد سے زائد فکر معاش، ناروا مصلحت بینی اور عافیت گزینی، اور مصنوعی تہذیب، نقلی زندگی اس تعلیم کی نمایاں پیداوار ہیں اقبال نے اس کی نشاندھی کی ہے:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جسنے　　　قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا　　　جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہین بخشا　　　جس میں رکھدی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو — خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش
(مدرسہ)

تعلیم جدید پر اقبالؒ کی کڑی نکتہ چینی!

نئی تعلیم پر اقبال کے غم و غصہ اور سخت گیری کی ایک بنیاد یہ ہے کہ یہ تعلیم بطالت و تعطل جمود و خمود، آرام طلبی و لذت کوشی کی تعلیم دیتی ہے اور زندگی کو بحرِ منجمد بنا دیتی ہے وہ طالب علم کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اسی طرح یہ تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب اس کے افکار اور اس کے مستقبل کے لئے نو آبادیات ColoNY کی زمین فراہم اور ہموار کرتی ہے اور نوجوانوں کو افرنگ زدہ بناتی ہے اور بلند معیار زندگی کی ہوس پیدا کر کے نئے نئے مسائل Problems سامنے لاتی ہے۔

مشرق کی روایات و خصوصیات کو ختم کر کے وہاں وہ مغربی معاشرہ برپا کر دینا چاہتی ہے جہاں بقول میکالے (شکل و صورت کے لحاظ سے مشرقی لیکن ذہن و طبیعت کے اعتبار سے مغربی انسان) پائے جانے لگیں۔

مغربی تعلیم پر اقبال کی تنقیدوں کا ایک پہلو یہ ہے کہ جس طرح اس کی بنیاد کفر و الحاد یا پھر ذہنی انتشار اور فکری انارکی پر ہے اسی طرح وہ یہ تمام ذہنی بیماریاں نئے دماغوں میں اتار دیتی ہے، فکر و فلسفہ، آزادیٔ رائے، و حریتِ خیال اور آزادانہ غور و خوض Freethinking کے نام سے ذہنی بے ربطی اور پریشان خیالی کو جنم دیتی ہے، اقبال کے خیال میں غلط بینی سے کور چشمی

اور عالمانہ بیدینی سے نادانی بہتر ہے:

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے　　زبینائے غلط بینے نکو تر

زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش　　زدانشمند بے دینے نکو تر!

اقبال کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ ان ذہنی جمناسٹکوں سے کیا حاصل جو انسان کو خلاباز اور ہوا پرواز بنا دیں لیکن اس کے جمے ہوئے قدم بھی اکھڑ جائیں اور وہ اپنا مقام بھی کھو بیٹھے:

ازاں فکرِ فلک پیما چہ حاصل　　کہ گردِ ثابت و سیّار گردد

مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد　　بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

یہ نظامِ تعلیم انسان کو مشینوں، صنعتوں اور ترقیوں کے آگے بے قیمت و بے حیثیت بنا دیتا ہے حالانکہ انسان ہی بحرِ وجود کا گوہرِ مقصود اور مزرعِ ہستی کا حاصل ہے، دنیا کو انسان کے تابع ہونا چاہیئے نہ کہ انسان کو دنیا اور متاعِ دنیا کے:

منہ از کف چراغ آرزو را　　بدست آور مقام ہائے وہو را

مشو در چار سوئے ایں جہاں گم　　بخود باز آو بشکن چار سو را

دو گیتی را بخود باید کشیدن　　نباید از حضورِ خود رمیدن

بہ نورِ دوش بیں امروز خود را　　ز دوش امروز را نتواں بریدن

(ارمغانِ حجاز)

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھکو　　تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی　　وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق

(ضربِ کلیم)

اقبال کی نظر میں فکرِ بشری، وحیِ الٰہی اور فیضانِ سماوی کے بغیر خام اور ناتمام رہتی ہے اس لئے فکری ناپختگی کے باوجود اسے شروع سے آزاد اور بے قید کر دینا پریشاں خیالی اور ژولیدہ نگاہی کو دعوت دینا ہے:

آزادیٔ فکر کے عنوان سے انھوں نے ایک بڑا بصیرت افروز اور معنی خیز قطعہ کہا ہے:

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی　　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار　　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ! (ضرب کلیم)

مشرق میں ناپختہ افکار و فلسفہ نے جو وبائی شکل اختیار کر لی ہے اور غیر ہضم شدہ خیالات نے جس طرح دنیا میں ذہنی بے اطمینانی Mental Discontent پیدا کر دی ہے وہ بھی کالج کا عطیہ ہے جو ہر نئی ذہنی اپج کو فلسفہ کا نام دیدیتا ہے:

بُرے ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز

"عصر حاضر" کے عنوان سے اقبال نے ایک قطعہ میں مشرق و مغرب کی بنیادی خرابیوں کو طشت از بام کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ مشینی دور کی تیز روی اور عجلت پسندی نے ہر شے کی پختگی ختم کر دی ہے اور فلسفہ کو بے ربط بنا دیا ہے۔ دیار فرنگ میں عشق و محبت کو ان کا حقیقی مقام اسی لئے نہیں ملا کہ لادینیت نے اس کا کوئی مرکز باقی نہیں چھوڑا اور مشرق میں عقل کو صحیح مقام اس لئے نہیں ملا کہ افکار میں کوئی تسلسل نہ تھا:

پختہ افکار کہاں ڈھونڈھنے جائے کوئی　　　اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر　　　چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق　　　عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام
(ضرب کلیم)

نظام تعلیم پر اقبال کی تنقید کا ایک رُخ یہ ہے کہ وہ نوجوانوں میں مغرب کی اندھی تقلید اور خالص پیروی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور ان میں جدت و اجتہاد کا کوئی جذبہ نہیں پیدا کرتا وہ کہتے ہیں کہ دنیا تو خود رسم و رواج میں جکڑی ہوئی ہے لیکن یہ دانش گاہیں اس سے بھی تنگ

دائروں میں بند ہیں ان میں جاکر عبقری دماغ بھی امامتِ عصر کے بجائے ابن الوقتی اور زمانہ سازی کرنے لگتے ہیں:

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں — بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار — کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت — وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو (اساتذہ)

اقبال کہتے ہیں کہ نئی نسل کا وجود اس کا ذاتی وجود نہیں بلکہ وہ یورپ کی پرچھائیں ہے اور اس کی مصنوعی زندگی بھی مستعار ہے۔ نئی نسل جسم و مادہ کا وہ ڈھانچہ ہے جسے مغربی معماروں نے تعمیر کیا ہے لیکن اس میں روح نہیں پھونکی ہے۔ اس کا وجود وہ مرصع نیام ہے جس میں کوئی تیغ قاطع نہیں اقبال بڑے مزے سے کہتے ہیں کہ نئی نسل کی نگاہ میں خدا کا وجود معدوم ہے لیکن میری نظر میں خود اس نسل ہی کا بود و وجود ہم نفسِ عدم ہے:

ترا وجود سراپا تجلیِ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر
تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود — مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود — کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا
(افرنگ زدہ: ضربِ کلیم)

اقبال کی رائے ہے کہ مغربی نظامِ تعلیم نے مسلم نوجوانوں کی معنوی روح کو کچلنے کی پوری کوشش کی ہے اور انھیں رجالِ کار کے بجائے مردِ بیمار بنا دیا اور سجیلا، نکیلا، صباحت پسند بنکر رہنا سکھا دیا ہے ان میں نزاکت و ملاحت، نرمی اور تخنث، اور نسائیت پیدا کر کے جہد و جہاد کی سرگرمیوں سے بہت دور کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری نظر میں اس علم کی کوئی قیمت نہیں جو مجاہد سے اس کے مردانہ اوصاف چھین لے اور مصافِ زندگی میں اسے سامانِ آرائش دے کر اس کے

ہتھیار لے لے۔

اقبال بڑی دردمندی اور جاں سوزی کے ساتھ پرخلوص انداز میں نئی نسل کے مربّی سے درخواست کرتے ہیں وہ جب ایک شفیق استاذ اور مہربان وغمخوار مربّی کی زبان سے یہ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں اور پوری ملت کا غم ان کے وجود میں سمٹ آیا ہے:

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا!
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے انکو سبق خود شکنی خودنگری کا
تو انکو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ انکی پریشاں نظری کا
کہہ جاتا ہوں میں زور جنوں میں ترے اسرار — مجھکو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا

(اے پیر حرم: ضرب کلیم)

اقبال کا نظریۂ علم وفن

اقبال علم وفن، شعروادب اور زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں ایک خاص رائے رکھتے تھے جو ان کے خیالات وتجربات کی بنیادوں پر قائم ہوتی تھی ان کی ایک رائے یہ تھی کہ شعرو ادب کا ملکہ اور ذوق سلیم خدا کا عظیم عطیہ اور ناقابل تسخیر ہتھیار ہے جس سے افکار و معاشرت میں انقلاب لایا جا سکتا ہے اور فاسد ماحول کو ختم کر کے دلوں میں غضب و انتقام اور طبیعتوں میں اضطراب پیدا کیا جا سکتا ہے اور پھر غلط نظریات کی جڑ کاٹ کر صالح اور صحت مند اقدار کی آبیاری کی جا سکتی ہے۔ اس لئے شاعر و ادیب کے قلم میں وہ تاثیر اور قوتِ تسخیر ہونا چاہئے جو عصائے موسیٰ، ید بیضا اور دمِ عیسیٰ میں تھی اسے دلبری اور قاہری کے ساتھ عالم انسانیت میں پیغامبری کا رول بھی ادا کرنا چاہئے۔

اقبال کا خیال ہے کہ جو ادب سرمایہ داروں کی فرمائش، کسی لالچ، کسی سطحی جذبہ کی

تسکین یا دل کی تسلی اور محض ذوق جمال کی تشفی اور خوشامد کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ ضائع اور مظلوم ادب ہے جسے نہ خاطر خواہ مقام ملا نہ اس سے صحیح کام لیا گیا۔ وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں کہ میں احساسِ جمال اور حسن کی کیفیات کا منکر نہیں اس لئے کہ یہ تو فطری جذبہ ہے لیکن معاشرے کے لئے اس محدود و اپاہج علم کا کیا فائدہ جو عصائے موسیٰ کی طرح حجر و شجر کو بھی متاثر نہ کر سکے وہ کہتے ہیں کہ شعر کو سحر اور سحر کو اعجاز تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ دلِ زندہ کی قوت و حیات اس میں مضطرب ہو اور اس کی رگوں میں زندگی اور تازگی کا گرم گرم خون دوڑ رہا ہو وہ بڑے درد اور روحانی کرب کے ساتھ اہلِ نظر اور فن کاروں سے کہتے ہیں کہ اس ذوقِ نظر سے کیا حاصل جو نظارہ ہی میں الجھ کر رہ جائے اور حقیقت کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔

شاعر کی اس آتش نوائی اور مغنی کی ناہید نفسی کا کیا فائدہ جو اپنے ماحول کو نہ گرما سکے اور نہ کسی دل تک راہ پا سکے۔ نسیم صبح اور بادِ صبا اگر چمن کے لئے پیامِ بہار نہ لائیں تو ان کی مسیحا نفسی کس کام کی ہے:-

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(فنونِ لطیفہ)

اقبال تو اس بلندی سے سوچتے ہیں لیکن اپنے ہم چشم معاصرین کی جب پستی دیکھتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ مشرق کے ساتھ عالم اسلام کے ذہنوں پر بھی عورت کا راج ہے اور وہاں کا شاعر ادیب بھی اسی کی بات کرتا اور اسی کا کلمہ پڑھتا ہے، مغنی اسی کے گیت گاتا اور مصور اسی کی نقش آرائی

اورصورت گری کرتا رہتا ہے اور فن کاروں کو ہر جگہ اس کے حسن کی ضو اور جمال کا پرتو کابوس کی طرح گھیرے رہتا ہے اس طرح وحدۃ الوجود کی جگہ یہ نیا ادبی وحدۃ الشہود ظہور میں آیا ہے جہاں عالم کی انتہا اور ابتدا عورت ہی تک پہنچتی ہے اس سطحی لذت پسندی اور ہوس مشربی کی طرف اقبال نے کھلے لفظوں میں اشارہ کیا کہ:

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا — انکے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری انکے صنم خانوں میں — زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اقبال اور علوم و فلسفہ

اقبال حکمت و فلسفہ اور دوسرے علوم نظری میں بھی اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی بھی نظریہ اور فلسفہ جب تک اپنی پشت پر جہد و جہاد کی قوت اور ایثار و قربانی کی ہمت نہیں رکھتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا فلسفہ ہو یا کوئی علم ہو وہ محض علمی بحث و نظر لفظی بازی گری اور مابعدالطبیعی مناقشہ آرائی تک محدود ہے اور وہ زندگی کے میدان میں نہیں اترتا اور انسانی معاشرے کے مسائل سے صرف نظر کرتا اور اپنی الگ دنیا میں رہنا چاہتا ہے تو ایسے علم و فلسفہ کے لئے زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ایسا نظریہ و فلسفہ ایک نہ ایک دن اپنی موت آپ مر جائے گا۔

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

فلسفہ کے عمیق مطالعہ اور اس کی طویل تحقیقات و تجربات نے انھیں یہ رائے قائم کرنے

پر مجبور کر دیا کہ فلسفہ زندگی کے مسائل کے حل میں سراسر ناکام ، اس کا آبدار صدف گوہر زندگی سے خالی اور وہ عملی دنیا سے بڑی حد تک کنارہ کش ہے۔

وہ انسانیت کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور نہ زندگی کو کوئی راہِ عمل دے سکتا ہے۔ زندگی کے مکمل دستور و نظام کے لئے وہ رسالتِ محمدی کا نام لیتے ہیں وہ اپنے ایک فلسفہ زدہ دوست کو ہمدردانہ عتاب و نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تو اصل کا سومناتی ہوں اور میرے آباؤ اجداد لاتی و مناتی تھے میرا خاندان برہمن تھا لیکن اس کے باوجود میں آغوش کفر سے نکل کر دامنِ اسلام میں پہنچا، لیکن تیری رگوں میں تو ہاشمی خون جاری ہے اور تجھے سید الاولین والآخرین ؐ سے قرابت و فرزندی کا فخر حاصل ہے لیکن تم انھیں چھوڑ کر فلسفیوں کے وہم و گماں کے شکار ہو رہے ہو ـــــ حالانکہ میں کہ مرے وجود میں فلسفہ گوشت پوست کی حیثیت رکھتا ہے اور میں اس میں اترا ہوا ہوں یہی سمجھتا ہوں کہ فلسفہ حقیقت کا حجاب ہے اور وہ انسان کو زندگی سے دور کر کے رہتا ہے اس کے مباحث روح عمل کو مضمحل بنانے میں افیون سے زیادہ تیز ہیں ہیگل بے چارہ بھی دوسروں کی طرح خالی خولی اور اسیر وہم و گماں ہے ـــ تمہاری زندگی میں شعلۂ دل کی آگ بجھ گئی ہے اور تو نے اپنی شخصیت کھو دی ہے اس لئے برگساں کے مقلد بن رہے ہو بنی آدم زندگی کا پیغام چاہتے ہیں لیکن فلسفہ خاموش ہے ـــ مومن کی اذاں وہ پیام بیداری ہے جس سے دنیا روشن اور کائنات بیدار ہو جاتی ہے وہی دین و مذہب زندگی کی تنظیم کر سکتے ہیں۔ جو ابراہیمؑ و محمدؐ کا عطیہ ہیں۔ اے ابن علی ابو علی سینا کی تقلید کب تک قائد قرشیؐ قائد بخاری (ابن سینا) سے کہیں زیادہ قابل تقلید ہے:

دل در سخن محمدی بند   اے پورِ علی ز بو علی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری   قائد قرشیؐ از بخاری!

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے خیال میں موجودہ نظام تعلیم اپنے مقصد میں بالکل

ناکام رہا ہے اور نہ وہ ایسی نسل کو تربیت دے سکا ہے کہ جو اپنی معلومات سے فائدہ اٹھاتی اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھتی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ افریقہ اور قطب شمالی کی نامعلوم سرزمین سے واقف اور حیوانات و نباتات سے آگاہ ہے لیکن انسانیت کی پہچان اور خودی کے عرفان سے قطعاً غافل! برق و بخارات، ایٹمی اور جوہری توانائی اور نیوکلیائی طاقت کا پتہ اسنے لگایا لیکن اپنی طاقت کا اندازہ اسے نہیں ہوا ہے۔ دنیا کو مسخر کر لیا لیکن اپنے اوپر قابو نہیں پا سکا وہ ہوا میں اڑتا اور پانی پر تیرتا ہے لیکن زمین پر انسان کی طرح چل نہیں سکتا۔

یہ سارا قصور نظام تعلیم کا ہے جسنے اس کا توازن غلط، اور مزاج فاسد کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ عجب بات ہے کہ شعاع شمسی کو گرفتار کرنے والا اپنا مقدر نہ چمکا سکا، نظام سیارگان کو جاننے والا کسی راہِ عمل پر نہیں پہنچ سکا اور سائنس کا محقق اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکا:

جسنے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آجتک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

اخیر میں اقبال اس مسلم نوجوان کی تمنا کرتے ہیں جس کی جوانی بیداغ اور جس کی ضرب کاری ہو جو جنگ میں شیر و پلنگ اور صلح میں حریر و پرنیاں ہو جو رزم و بزم دونوں کا حق ادا کرے جو "نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو" کی مثال اور صلح و جنگ میں مثالی شخصیت کی مالک ہو جس کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوں جو فقر میں غنی اور امیری میں فقیر ہو، بوقت تنگدستی خوددار و غیور اور بوقت فراغ کریم و حلیم ہو جو عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتی ہو، جو حلقۂ یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح تند و گرم ہو۔ کبھی وہ شبنم ہو جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پہنچتی ہے اور کبھی وہ طوفان جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں اگر اس کی راہ میں کہستان و سنگستان آئیں تو سیل تندرو اور اگر محبت کا شبستان

سامنے ہو تو "جوئے نغمہ خواں" بن جائے۔ جو صدیقؓ کا ایمانی جلال، "علی مرتضیٰؓ کی قوت وفتوت ابوذرؓ کا فقر واستغنا اور سلمانؓ کا صدق وصفا رکھتی ہو۔ جس کا یقین' بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی ہو۔ جو مومنانہ حکمت وفراست کی آئینہ دار اور ہمت مردانہ کی علمبردار ہو جو شہادت کو اپنا کر حکومتوں کو ٹھکرا سکتی ہو۔ جو ستاروں پر کمند ڈال سکتی اور نوامیس فطرت کو نخچیر بنا سکتی ہو۔ جو اپنی رفعت وعظمت میں فرشتوں کے لئے بھی باعث رشک ہو جس کا وجود دنیا میں کفر وباطل کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہو جس کی قیمت پوری کائنات بھی نہ بن سکے اور جسے اس کے خالق ومالک کے سوا کوئی نہ خرید سکے جس کے مقاصد جلیلہ اُسے زندگی کی سطحیت اور زیب وزینت سے بلند تر کر چکے ہوں جو چنگ ورنگ اور نغمہ وآہنگ کے فریب سے نکل چکی ہو اور تہذیب جدید کے بلبل وطاؤس کی تقلید سے یہ کہہ کر انکار کر چکی ہو کہ ؎

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ!

اقبال اور فنونِ لطیفہ[1]

فنونِ لطیفہ کی حیثیت اقبال کی نگاہ میں کسی سنجیدہ اور مفید علم سے کم نہیں وہ فن کاروں کو نسل انسانی کا معلم اور پیغمبرانہ انقلاب کا نقیب سمجھتے ہیں وہ فائن آرٹ کو تفریح و تسلی اور سستی افادیت کے لئے استعمال کرنے کے خلاف ہیں اس کے برعکس انسانی خودی اور اس کی شخصیت کی تعمیر کا کام اس سے لینا چاہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مظاہر و مناظر میں پھنس کر رہ جانے کے بجائے فنونِ لطیفہ کو دلوں تک اپنی رہ گزر بنانا چاہیئے اور نہ رسی دروں بینی اور حقیقت پسندی پر مبنی ہونا چاہیئے دین و ادب، حکمت و ہنر دونوں کو انسان کی خفتہ صلاحیتوں اور نہفتہ امکانات کو ابھارنے نکھارنے اور سنوارنے کا فریضہ انجام دینا چاہیئے۔ زوال پزیر دین و ادب کی علامت ان کی نگاہ میں یہ ہے کہ وہ انسانیت اور زندگی کے حقیقی مسائل سے صرف نظر کر لیتے ہیں:

---

[1] اضافہ از مترجم

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ (دین و ہنر)

اسلام کے زیرِ اثر اقبال نے فنونِ لطیفہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کا صحیح مقام و پیام متعین کیا وہ فن کار کی تخلیق کے دل سے قائل اور قدر داں ہیں لیکن فنونِ لطیفہ میں وہ شعر و ادب اور فلسفہ کو اولیں مقام دیتے ہیں نغمہ و آہنگ اور خشت و سنگ کو ان کے ہاں ثانوی درجہ حاصل ہے اس لئے کہ وہ ان سب کی بنیاد فکر و خیال ہی کو قرار دیتے ہیں:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ خشت و سنگ سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے — اس آبجو سے کئے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے — جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا (تخلیق)

اقبال جس طرح اپنی الگ اور خاص اصطلاحات رکھتے ہیں یعنی علم و عشق، عقل و دل، فقر و خودی، قلندری و شاہینی وغیرہ اسی طرح ان کا جنون بھی باہوش ہے وہ جنوں کو خلوصِ عشق، دل کی لگن، اور ایک جذبۂ سرشاری سمجھتے ہیں جس سے ماقوق الفطرت اور خارق عادت کرامات اور معجزات صادر ہوتے ہیں۔ جنوں ان کے ہاں جسم و روح کی کسی کام کے لئے متفقہ یکسوئی کا نام ہے اسی لئے وہ اپنی نظم مدنیتِ اسلام میں کہتے ہیں:

بتاؤں تجھکو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں!

زندگی کی طرح وہ فنونِ لطیفہ میں بھی جنوں کی کارفرمائی اور فن کار کا انتہائی خلوص اور ریاض پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عشق و جنوں کو صحرا کی فضا نہیں آبادی کی ہوا بھی راس

آتی ہے:

کسے خبر کہ جنوں میں کمال اور بھی ہیں — کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بے گانہ
ہجوم مدرسہ بھی ساز گار ہے اس کو — کہ اسکے واسطے لازم نہیں ہے ویرانہ (جنوں)

وہ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں:

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے — جسنے سیئے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں — مستی ہے جس کی بے منت تاک

اقبال نے ایک مضمون میں اپنے ادبی اور فنی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فن کار کا پہلا فرض ہے کہ اپنی خودی، اپنے اندرون، اور اپنے حقیقی یا روحانی وجود کا اثبات کرے اسلئے کہ اظہارِ "انا" اور اثباتِ وجود ہی سے "بقائے دوام" بھی ملتی ہے اس کے ساتھ ہی اقبال نے لکھا ہے فن کار کو اپنی ذات سے چل کر کائنات تک پہنچنا چاہئے اور کثرت میں وحدت، جلوت میں خلوت اور اجتماعی بیخودی میں انفرادی خودی کا دامن ہاتھ سے نہ دینا چاہئے اس لئے کہ یہ مادی کائنات مٹی کی طرح ہر شے کو جذب اور ہضم کر لینا چاہتی ہے چنانچہ ادب و فن کے وہی شاہکار دوامی اور حقیقی کہے جا سکتے ہیں جن میں مادیت سے روحانیت کی طرف گریز اور مادیت پر فتحمندی ملتی ہو۔ اقبال نے مزید لکھا ہے کہ فن کار کو حسن کے امکانات کا سراغ اپنے ہی اندر لگانا چاہئے نہ کہ خارجی اور ظاہری جمالیات کو اپنا مطمحِ نظر بنانا چاہئے انھوں نے اس موقع پر ایک معنی خیز شعر لکھا ہے:

حسن را از خود بروں جستن خطاست
آنچہ می بایست پیشِ ما کجاست؟

یعنی فن کا کام کیا ہے؟ پر قناعت نہیں بلکہ کیا ہونا چاہیئے؟ کی جستجو اور آرزو پیدا کر دینا ہے:

یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں — کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود!

غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی   نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہر کبود   (امید)

وجود کے بلند آہنگ اظہار و اعلان کے لئے اقبال خلوصِ عشق، سوزِ خودی جذبۂ زندگی اور عرفانِ نفس کو ضروری قرار دیتے ہیں:

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود   کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر   وائے صورت گری و شاعری و نائے سرود
مکتب و مدرسہ جز درسِ نبودن ندہند   بودن آموز کہ ہم باشی وہم خواہی بود   (وجود)

اثباتِ وجود و خودی سے پہلے فن کار کو اپنی پہچان ضروری ہے پھر تعمیرِ خودی کے لئے نیاز میں ناز پیدا کرنا اور قطرہ کا روکشِ دریا ہونا لازم ہے اقبال کی لطافتِ حس دیکھئے کہ وہ نماز میں سجدے کو بیخودی اور قیام کو خودی کا اظہار سمجھتے ہیں اور عبادت کی محویت میں بھی عبدیت کی انفرادیت اور اس کا انیکھا پن برقرار رکھنا چاہتے ہیں:

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک   ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک   کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک   کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک   (رومی)

اقبال ہر اس فن و ہنر کے مخالف ہیں جو زندگی سے دور لیجاتا ہے اور انفرادیت کو کچلتا ہے اور جس میں انسان تابع محض اور کائنات گوہرِ مقصود ہوتی ہے وہ موجودہ تمثیل، تھیٹر اور ڈرامہ کے اسی لئے خلاف ہیں کہ وہ مصنوعی پن، نقالی، اور بہروپ کے سوا کچھ نہیں جس میں انسان "تماشا" اور کائنات تماش بیں بن جاتی ہے:

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود   حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات!
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام   اسی کے نور سے پیدا ہیں تیری ذات و صفات

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ! | دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے | رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات (تیاتر)

وہ مصوری Painting میں انسانی شخصیت کی نمود اور تعمیرِ انسانیت کے کسی پیام کا وجود ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لئے مشرقی مصوری کی روحانیت کے قائل اور مغرب کی تجریدی مصوری Abstract Art سے نفور رہیں، مصوری میں انسان کے شائستہ اور ارفع جذبات و احساسات کی نقش آرائی اور صورت گری انھیں پسند ہے اور سطحی اور وقتی خیالات کے وہ قائل نہیں مشرقی مصوری کا ازلی سوز و سرور اور اس کی روحانیت انھیں دل سے پسند ہے:

مجکو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد | کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے | آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی (مصوّر)

ادو و سرود، صوت و آہنگ اور نغمہ و زخمہ میں بھی انھیں وہ آتش نوائی اور شعلہ نفسی پسند ہے جس میں دل کی آنچ ہو اور رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں ہو اور مغنی صرف لہجہ کے اتار چڑھاؤ، سُر تال اور نغمہ کے زیر و بم کا نمائندہ نہ ہو بلکہ صاحبِ دل بھی ہو:

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے | اصل اسکی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے
دل کیا ہے اسکی مستی و قوت کہاں سے ہے | کیوں اسکی اک نگاہ الٹتی ہے تختِ کے
کیوں اسکی زندگی سے ہے اقوام میں حیات | کیوں اسکے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے
کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں | جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا | سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے (سرود)

اقبال اس نغمۂ جاوداں، لافانی آہنگ اور اس مغنیِ آتش نفس کو ڈھونڈتے ہیں جسکی صدا "جلوۂ برقِ فنا" کی جگہ "کرشمۂ دوام و بقا" ہو جس سے دل زندہ بیدار ہو جائے اور ستاروں کا وجود

پگھل جائے جو انسانیت کے لئے مساوات کا پیامی ہو، اور جس سے پوری کائنات بیدار ہو جائے:

مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے | تو رہے اور ترا زمزمۂ لاموجود
جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی | منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام | حرام میری نگاہوں میں نائے چنگ و رباب
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود | وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

اقبال مصوری اور موسیقی کو غلاموں کے فنونِ لطیفہ میں شمار کرتے ہیں جن سے فطرت انسانی طرح طرح کی تکلفات کی غلام بن جاتی ہے وہ کہتے ہیں کہ نغمہ و موسیقی زندگی کے بجائے موت کا پیغام دیتے ہیں اور آدمی کو زار و ناتواں بناتے اور دنیا سے بیزار کر دیتے ہیں اس سے دل کا سوز و گداز ختم ہو کر ایک غم آگیں کیفیت سوہانِ روح بن جاتی ہے اس سے وہ غم بھی نہیں ملتا جو دوسرے تمام غموں کو بھلا دیتا ہے بلکہ اس کا غم یاس و قنوط کی پیداوار ہوتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں نغمہ کو وہ سیلِ تندرَو ہونا چاہیئے جو غموں کا خاتمہ کر دے جو جنوں پرودہ اور خونِ دل میں حل کردہ ہو ان کے خیال میں نغمہ کی انتہا یہ ہے کہ وہ بے صوت و صدا ہو جائے:

می شناسی در سرود است آں مقام
کاندرو بے حرف می روید کلام

وہ کہتے ہیں جو نغمہ و آہنگ معنی و پیام نہیں رکھتا وہ مردہ اور افسردہ ہے اور معنی مولانا روم کے الفاظ میں وہ ہیں جو آدمی کو اپیل کریں نہ کہ دوسرے خارجی نقش و نگار پر مائل کر دیں:

معنی آں باشد کہ بستاند ترا | بے نیاز از نقش گرداند ترا
معنی آں نبود کہ کور و کر کند | مرد را برنقش عاشق تر کند!

اس کے بعد ان کا روئے سخن "مصوری" کی طرف ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ مصوری میں

نہ ابراہیمی فطرت ہے نہ آذری صنعت بلکہ اس میں سراسر اوٹ پٹانگ جزئیات کی تصویرکشی اور مجموعی حیثیت سے موت کی نقش گری ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مصور خود کسی عقیدۂ و پیام پر مطمئن نہیں اسلئے اس میں نہ لذتِ تحقیق ہے نہ قوتِ تخلیق۔ اس کا اپنا کوئی ذوق نہیں بلکہ وہ عوامی ذوق کا اجیر اور کرائے کا مزدور ہے وہ حسن کو مظاہر قدرت اور مناظرِ فطرت میں ڈھونڈتا ہے لیکن وہ تو ایک داخلی کیفیت ہے۔

جو فن کار انسان اور کائنات کو ایک سطح سے دیکھتا اور مٹی کی پیداوار سمجھتا ہے وہ اپنے ساتھ انصاف نہیں کرتا فن کار اور اہل کمال میں کچھ وہ باتیں بھی ہوتی ہیں جو غیر معمولی اور معجزانہ کہی جا سکتی ہیں:

خویش را آدم اگر خاکی شمرد — نورِ یزداں در ضمیر او بمرد
چوں کلیمے شد بروں از خویشتن — دستِ او تاریک و چوبِ او رسن
زندگی بے قوتِ اعجاز نیست! — ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست!

اقبال کہتے ہیں کہ فن کار کو فطرت کی بازیافت ہی نہیں بلکہ اپنے اندر کے مافوق الفطرت عناصر سے فطرت پر اضافہ بھی کرنا چاہیئے اور حیات و کائنات میں ایک دوسری حیات و کائنات کی طرح نو ڈالنا چاہیئے اور اپنی روح کے وفور و فراوانی سے زندگی کے ہر خلا کو پر کر دینا چاہیئے:

زاں فراوانی کہ اندر جانِ اوست — ہر تہی را پر نمودن شانِ اوست
فطرتِ پاکش عیار خوب و زشت — صنعتش آئینہ دارِ خوب و زشت (زبورِ عجم)

فن کار کے لئے تسخیر کائنات سے پہلے تسخیر ذات اور تعمیر خودی ضروری ہے۔ انہی بنیادوں پر فرد اپنی تکمیل کے بعد وجود کائنات کا اہم جز بن جاتا، اور رفتہ رفتہ کونین پر چھا جاتا ہے:

منہ پا در بیابانِ طلب سست — نخستیں گیر آں عالم کہ در تست

اگر زیری، زخود گیری زبر شو | خدا خواہی؟ بخود نزدیک تر شو
بہ تسخیر خود افتادی اگر طاق! | ترا آساں شود تسخیر آفاق (گلشنِ راز جدید)

موسیقی و مصوری کے مقابلے پر اقبال فن تعمیر Architecture کے اس کے مناسب حدود میں قائل ہیں اور ان کا یہ خیال ذاتی نہیں اسلامی فکر کا عطیہ ہے فن تعمیر میں بھی وہ اس عمارت سازی کو مستحسن سمجھتے ہیں جسکے پیچھے کوئی پیغام اور جس کی بنیادوں میں عشق کا استحکام ہو وہ اندلس جاکر قصر الحمرار دیکھتے ہیں لیکن اس سے متاثر نہیں ہوتے اس کے برعکس مسجد قرطبہ کو دیکھ کر ان کی روح پھڑک اٹھتی اور وجدان جھوم اٹھتا ہے وہ خود لکھتے ہیں۔

"الحمرار کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی"[1]

اسی طرح وہ پیرس کی عالی شان مسجد دیکھتے ہیں لیکن وہ ان کا دامنِ نظر نہیں کھینچتی اس لئے کہ اس کی اساس میں کوئی پرکشش بات نہیں:

مری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے | کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ!
حرم نہیں ہے فرنگی کرشمہ بازوں نے | تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بتخانہ
یہ بتکدہ انہی غارتگروں کی ہے تعمیر | دمشق ہاتھ سے جنکے ہوا ہے ویرانہ (پیرس کی مسجد)

لیکن سلطان قطب الدین ایبک کی بنائی ہوئی "مسجد قوت الاسلام" کا کھنڈر ان کو جان جی سے بھاتا ہے اور وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں اس لئے کہ اس ویرانہ میں انھیں عزم و اخلاص کا وہ تاریخی پس منظر یاد آجاتا ہے جب اسلام کا مسافر غربت کدۂ ہند میں رخت انداز ہوا تھا اس روحانی یاد سے ان کے دل کا ہر تار بج اٹھتا ہے اور وہ یوں حسرت سنج ہو جاتے ہیں:

---

[1] اقبال نامہ ۲/۳۲۲

ہے مرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی — لا الہٰ مردہ و افسردہ و بے ذوقِ نمود
چشمِ فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھکو — کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقامِ محمود
کیوں مسلماں نہ خجل ہو تری سنگینی سے — کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اسکا وجود
ہے تری شان کی شایاں اسی مومن کی نماز — جسکی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود!
اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز — بے تب و تابِ دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ — کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود؟ (مسجدِ قوۃ الاسلام)

وہ قطب الدین ایبک، شیر شاہ سوری اور شاہجہاں کی تعمیرات کو مردانِ آزاد کے فنِ تعمیر کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم میں دل و جگر کی تاب ہے تو ان کی یادگاروں کو دیکھو کہ کس طرح انھوں نے اپنی شخصیت کو ان عظیم عمارتوں میں ظاہر کیا ہے اور پتھروں کی سلوں میں وقتِ گریز پا کو بند کر دیا ہے ان کی پختگی دیکھ کر آدمی میں پختگی پیدا ہوتی اور اس کی دنیا بدل جاتی ہے، ہمت مردانہ اور طبع بلند ان پتھروں کے سینے میں لعل ارجمند کی طرح چمک رہے ہیں یہ پتھر کسکی سجدہ گاہ ہیں یہ مجھ سے مت پوچھ رودادِ جاں اہل دل ہی بتا سکتے ہیں میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جس لوحِ جبیں میں نیروئے الا اللہ نہیں وہ شایانِ بارگاہ نہیں:

در من آں نیروئے الا اللہ نیست
سجدہ ام شایانِ ایں درگاہ نیست!

اس کے ساتھ وہ تاج محل کو خراج عقیدت دیتے ہوئے کہتے ہیں "تاج کو چاندنی میں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مرمر کی سلوں میں آبِ رواں سے زیادہ تیزی آگئی ہے اور ابد کا طویل دور یہاں کے ایک ایک لمحہ کے برابر ہوگیا ہے یہاں عشق نے پتھروں کی زبانی اپنا راز کھولا اور پتھروں کو نوکِ مژگاں میں پرو دیا ہے یہاں سنگ و خشت سے جنت کے نغمے پھوٹ رہے ہیں اور عشق

حدود و تعینات کی سرحدیں پھاند کر لازوال بن گیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ محبت ہی ہے جو انسان کو پر لگا دیتی ہے، اور جذبات کو بلند و ارجمند کر دیتی ہے، عشق سے عقل کی صیقل ہوتی ہے اور خشت و سنگ میں جوہر آئینہ کی جھلک آجاتی ہے عشق سے اہل دل کو سینۂ سینا اور اہل ہنر کو ید بیضا مل جاتا ہے۔

اقبال کے نظریۂ فن کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ جمال کو جلال ہی کا ایک رخ سمجھتے ہیں اور جمالِ بے جلال انھیں متاثر نہیں کرتا:

دلبری بے قاہری جادوگری است — دلبری با قاہری پیغمبری است (زبورِ عجم)
تا نہ گیری از جلالِ حق نصیب — ہم نیابی از جمالِ حق نصیب

ابتدائے عشق و مستی قاہری است — انتہائے عشق و مستی دلبری است (پس چہ باید کرد)

جبینِ بندۂ حق میں نمود ہے جسکی — اسی جلال سے لبریز ہے ضمیرِ وجود (ضربِ کلیم)
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے — یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل!
اسی نگاہ میں ہے قاہری و جباری — اسی نگاہ میں ہے دلبری و رعنائی

اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں انھوں نے ایک نظم "جلال و جمال" میں وضاحت کر دی ہے:

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدریؓ کافی — ترے نصیب فلاطوں کی تیزئ ادراک!
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی — کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک
مجھے سزا کیلئے بھی نہیں قبول وہ آگ — کہ جسکا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

غالباً یہ اقبال ہی کا کہا ہوا لطیفہ ہے کہ کسی یورپی جوڑے نے جب آبشارِ نیاگرا دیکھا تو عورت بولی "اف! کتنا حسین ہے" جبکہ مرد نے کہا "ہاں! بہت پر شکوہ ہے"۔ اس سے اس

صحت مند ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کیوں جلال و شکوہ کے قائل ہیں ـــــــــــ

جہاں تک فن کار کے فرائض کا تعلق ہے اقبال کہتے ہیں کہ اس کا انداز نظر اور اس کی افتاد طبع Attitude عام سطح سے بلند پاکیزہ اور معیاری ہونا چاہیئے اسے وہ نظر حاصل کرنا چاہیئے جو شئے کی حقیقت دیکھ سکے اور بادہ میں نشہ کا اندازہ کر لے (در بادہ نشہ می نگرم آں نظر بدہ) ان کے خیال میں یہ نگاہ ہی ہے جو فن کار کے نقطۂ نظر کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ٹھہرتی ہے اس لئے اسے ایسا ہونا چاہیئے کہ حسن حقیقی تک پہنچنے کے لئے کوئی حجاب اس کے لئے حجاب نہ رہے۔ اسے رجائی اور امید پرور ہونا چاہیئے تاکہ تخریب میں تعمیر ویرانی میں آبادکاری اور بگاڑ میں بناؤ کی جھلک دیکھ سکے۔ ان کی رائے میں فن کار کی نگاہ شوق فطرت کا صرف آئینہ ہی نہیں بلکہ اس کا معیار اور کسوٹی بھی ہے وہ صرف دیکھتا ہی نہیں پرکھتا بھی ہے جانتا ہی نہیں جانچتا بھی ہے اس طرح وہ فطرت کے حسن میں اپنے حسنِ نظر سے اضافہ کرتا ہے اور اسے نئی معنویت عطا کرتا ہے وہ اپنی نظم نگاہِ شوق میں کہتے ہیں:

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا — کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوقِ آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں — نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی!
اسی نگاہ سے محکوم قوم کے فرزند — ہوئے جہاں میں سزاوارِ کارفرمائی
اسی نگاہ سے ہر ذرہ کو جنوں میرا — سکھا رہا ہے رہ و رسمِ دشت پیمائی
نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو — ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی (ضربِ کلیم)

فن کار کی انفرادیت اور مخصوص انداز نظر کے بارے میں کہتے ہیں:

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

ان کے خیال میں فن کار اپنی ذات سے انجمن اور آپ اپنی دنیا ہوتا ہے یعنی خارجی دنیا کی تعمیر جدید سے پہلے عالمِ نو پہلے اس کی اندرونی دنیا میں کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور پھر وہ اس نقشے کے مطابق خیال کو عمل بنانا چاہتا ہے:

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر
بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کفِ خاک روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو صیاد ہیں مردانِ ہنرمند کہ نخچیر؟

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے

اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اقبال فن کار کیلئے محنت و محویت، مقصد کا عشق اور نصب العین کے لئے خلوص اور لگن کے کسقدر قائل ہیں ریاض اور جانسوزی کی ضرورت ان کے ہاں ذوقِ سلیم کے باوجود باقی رہتی ہے وہ "تلامیذالرحمٰن" کی سہل انکاری کے قائل نہیں:

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت لہو ترنگ ہے، غافل نہ جل ترنگ

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی، اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ از ہر چہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز!

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد!

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

(ضربِ کلیم)

"انسانِ کامل" اقبال کی نگاہ میں

اقبال کی نگاہِ متجسس کو اس عالمِ رنگ و بو میں جو اپنے اندر گوناگوں دلفریبیاں اور دلچسپیاں رکھتی ہے، صرف درندوں کا بھٹ اور چوپایوں کا جنگل نظر آیا اور اس کی متجسسانہ نگاہیں اِس درندوں اور چوپایوں کی دنیا میں کسی "انسان" کی جویا ہیں۔ اپنے اس تلاش و جستجو کی ابتدا اپنی مشہور کتاب "اسرارِ خودی" میں مولانا جلال الدین رومی کے اِن اشعار سے کی ہے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اندھیری رات ہے اور ایک درویش سن رسیدہ ہاتھ میں مشعل لئے

کوچہ و بازار کی خاک چھانتا پھرتا ہے جیسے اس کی نگاہ کسی گمشدہ کی تلاش میں ہو میں نے کہا حضرت سلامت کس چیز کی تلاش ہے؟ فرمانے لگے ان درندوں اور چوپایوں کی بستی میں رہتے رہتے طبیعت عاجز آگئی ہے، اب اس وسیع کائنات میں کسی "انسان" کی تلاش میں نکلا ہوں، ایک ایسا نوجوان جس کی مردانگی اور شخصیت میری روح کو تسکین اور بالیدگی عطا کر سکے میں نے کہا آپ کس دھوکے میں ہیں؟ یہ تو عنقا کی تلاش ہے۔ اس کے پیچھے اپنے آپ کو کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں؟ میں نے اس راہ میں در در کی خاک چھانی ہے، دشت و صحرا، آبادی و ویرانہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں میرے قدم نہ پہنچے ہوں مگر اس کی حقیقت تو کیا پرچھائیں بھی نظر نہ آئی، درویش نے کہا مجھے تو اس شئے کی تلاش و جستجو زیادہ محبوب ہے جس کا وجود نادر اور جس کا حصول آسان نہ ہو ——— !

سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس "گمشدہ انسان" کو اس وسیع کائنات میں پا لیا یا حیران و سرگرداں بھٹکتے پھرے؟ اقبال کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کی طرف اچھی نشاندہی کرتا ہے بیک نظر اور بلا خوف تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں اقبال نے اس کھوئے ہوئے انسان کو پا لیا اور نہ صرف پایا بلکہ اس کو اچھی طرح پہچانا اور زندگی کے طویل ایام اس کے ساتھ گذارے۔ اقبال کا یہ اکتشاف کولمبس کی نئی دنیا کے اکتشاف سے زیادہ دقیع اور بڑا اکتشاف ہے اور بلاشبہ ایک فتح عظیم ہے اس لئے کہ کھوئے ہوئے انسان کی تلاش و جستجو اور پھر اس میں کامیابی اس عالم کی سب سے بڑی خوش بختی اور سب سے بڑی یافت ہے، خصوصاً اس دور میں جب کہ "انسان" کھو چکا ہو اور انسانیت افسانہ بن چکی ہو۔

اقبال کا وہ گمشدہ انسان جسے وہ "انسان کامل" سے تعبیر کرتا ہے کہاں ہے؟ اور کون ہے؟ مجھے یہ ڈر ہے کہ ہم میں سے اکثر اس سوال کا جواب سن کر چونک پڑیں گے

جب کہ ان کے سامنے یہ حقیقت آئے گی کہ اقبال کا "انسان کامل" ایک "سچا مسلم" ہے اور ان کا یہ چونکنا بڑی حد تک بجا ہے کیونکہ وہ لوگ جن کی نگاہوں کے سامنے لفظ مسلم کے بعد ایک خشک جامد اور بجھی بجھی زندگی گذارنے والے انسان کی تصویر پھر جاتی ہے، وہ کبھی بھی اقبال کے انسان کامل کا تصور کسی "مسلم" سے نہیں کر سکتے۔ لیکن اقبال کا مرد مومن دراصل قرآنی نظریہ کا انسان کامل ہی ہے۔

اقبال کے اس مرد مومن اور "مسلم مثالی" کو اس کے ایمان کی قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت دنیا کے ان سارے انسانوں سے جو شک وریب میں مبتلا ہیں، ممتاز کر دیتی ہے اور اسی طرح وہ بزدل انسانوں کے مقابلہ میں اپنی شجاعت و مردانگی اور روحانی قوت سے ممتاز ہے۔ ایک مسلم کی توحید خالص اسے بندۂ انسان اور بندۂ مال و زر سے علیحدہ کر دیتی ہے اس کی آفاقیت و انسانیت، وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیاز کی جڑ کاٹ دیتی ہے وہ مسلم مثالی زندگی کا ایک پیام رکھتا ہے۔ جس کے ماتحت وہ زندگی گذارتا ہے زندگی کی قدریں خواہ بدل جائیں اور انسانی زندگی میں کتنا بڑا ہی انقلاب کیوں نہ آجائے لیکن اس کے اندر نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ وہ خود اپنے آپ کو بدلتا ہے اس مسلم کی مثال قرآن نے اپنے سادہ اور بلیغ لفظوں میں اس طرح بیان کی ہے کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اصلها ثابت وفرعها فی السماءِ اس کی مثال ایسے پاک درخت کی ہے۔ جس کی جڑیں جمی ہوں اور شاخیں دور تک پھیلی ہوئی ہوں، اقبال کہتا ہے:

نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

انسان کامل کے اس تصور سے ہمارے ذہنوں میں "مسلم" کی دو قسمیں آتی ہیں

ایک اس کا وجود انسانی ہے دوسرا اس کا وجود ایمانی! اپنے وجود انسانی میں اس میں اور دوسرے انسانوں میں اشتراک ہے عام انسانوں کی طرح پیدا ہوتا ہے اور ویسے ہی پروان چڑھتا اور بڑا ہوتا ہے ہر انسان کی طرح اسے بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی! اسے گرمی کا بھی احساس ہوتا ہے اور سردی کا بھی، بیمار بھی پڑتا ہے اور صحت مند بھی ہوتا ہے، فقر و غنا میں بھی وہ عام انسانوں کے مثل ہے، زراعت و تجارت اور دوسرے انسانی شعبوں سے بھی اسے دلچسپی ہے اولاد سے محبت کرتا ہے اور اپنے پہلو میں بھی دل رکھتا ہے، غرض کہ وہ اپنے وجود انسانی میں قانون طبعی کا ویسا ہی تابع ہے، جیسے اس کے مثل اور دوسرے انسان! انقلاب زمانہ اور حوادث روزگار اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برت سکتے، محض اس لئے کہ اس کا کوئی خاص نام ہے اور اس کا تعلق کسی خاص نسل سے ہے یا وہ کوئی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے بلکہ اس کا وجود اس وسیع کائنات میں صرف ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور عالم کے اس بحر ذخار میں اس کی مثال ایک موج کی ہے اگر ایک مسلم بھی عام انسانوں کی طرح زندگی گذارنے پر اکتفا کرے تو پھر اس کی اس کائنات میں کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی اور اس کی موت پر نہ زمین روئے گی اور نہ آسمان ماتم کناں ہوگا اور اس دنیا کی نیرنگیوں میں کچھ بھی کمی واقع نہ ہوگی،

لیکن اس کا وجود ایمانی اپنے اندر ایک پیام رکھتا ہے، جو انبیاء کا پیام ہے زندگی کے بارے میں اس کے کچھ مبادی اور اعتقادات ہیں، جن پر وہ ایمان رکھتا ہے اور اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے گذرتی ہے اس حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو وہ حیات انسانی کے اسرار سربستہ کا ایک راز ہے عالم کی بقا کے لئے اس کا وجود ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے، انسانی زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے، لہذا وہ مرد مومن اور مسلم مثالی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کائنات میں زندگی گذارے، پھلے، پھولے اور پروان چڑھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کائنات

کی بقا کے لئے اس کا وجود اور اس کا پھلنا پھولنا، پروان چڑھنا ضروری ہے جس طرح اس کائنات کو پانی، ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے اسی طرح اسے ایک مرد مومن کی بھی ضرورت ہے اگر حیات انسانی پانی ہوا، روشنی اور حرارت و برودت کے وجود پر منحصر ہے تو اسی طرح ایک ایسے مقصد زندگی، روح ایمانی اور اخلاق کا وجود بھی ناگزیر ہے جس کی روشنی انبیاء علیہم السلام کی دعوت و پیام سے حاصل کی گئی ہو اور جس کا بوجھ ایک مرد مومن کا دوش ناتواں اٹھائے ہوئے ہو اور اس کے قیام و بقا کے لئے اپنی زندگی کی ساری قوتوں اور توانائیوں کو لگا رکھا ہو اس لئے کہ اگر مومن نہ ہو تو یہ پیام زندگی اور مقاصد بلند ضائع ہو جائیں گے اور ان کا وجود عالم میں ایک راز سربستہ بن کر رہ جائے گا۔ اس مرد مومن کا وجود و بقا اس عالم میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت آفتاب جہانتاب کی ہے اور ان روشن ستاروں کی! نسلیں اور امتیں پیدا ہوں گی اور فنا ہوں گی، آبادیاں ویران ہوں گی اور ویرانے آباد، حکومتیں بنیں گی اور مٹیں گی، ایک تہذیب و تمدن کی جگہ دوسری تہذیب لے گی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا، لیکن اس مسلم مثالی کا وجود ہمیشہ باقی رہے گا۔

اقبال کا مرد مومن زندہ جاوید ہے، اس لئے کہ وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیام رکھتا ہے، اس کے سینے میں ایک زندہ جاوید امانت ہے اور اس کی زندگی ایک زندہ جاوید مقصد کے لئے گذرتی ہے،

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد ہمیشہ باقی رہے گا اور موت کبھی اسے اپنی آغوش میں نہ لے گی بلکہ اسکی مثال اس بحر ذخار کی ہے جس کی گود میں موجیں اٹھتی رہتی

ہیں، اور فنا ہوتی رہتی ہیں، حیات انسانی کے اس سمندر میں بھی موجیں اٹھتی رہیں گی اور فنا ہوتی رہیں گی لیکن اس کی حقیقت ہمیشہ باقی رہے گی،

اقبال کی نگاہ بلند ابھی یہاں پر رکتی نہیں بلکہ اس کی نگاہ کہیں اور پہنچتی ہے وہ کہتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد وجود ہی صرف مرد مومن ہے۔ عالم کا وجود اس کے لئے ہے اور وہ صرف اللہ کے لئے! علماء و محدثین کے نزدیک یہ حدیث نبوی لولاک لما خلقت الافلاک کی صحت لفظاً اور روایتاً خواہ کیسی ہی ہو لیکن اس کی نگاہ حقیقت بیں کچھ اور دیکھتی ہے وہ قرآن کی روح اور اس کی حقیقت پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے ایک "مسلمان" اور اس کا بلند "پیغام" ہے وسیع انسانی تاریخ پر اس کی غائر نظر ہے، عالم کی قدروں اور اشیاء کی طبیعتوں کا اسے خوب اندازہ ہے اس لئے یہ حقیقت اس پر اچھی طرح واضح ہے کہ یہ کائنات اور اس کے سارے لوازمات صرف ایک سچے مسلمان کے لئے وجود میں آئے ہیں۔ وہ اللہ کا اس سرزمین پر نائب اور خلیفہ ہے اس کائنات کے تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے:

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اور اس عقیدہ و فکر کو عملاً بروئے کار لانے کے لئے اس پر مسلسل جدوجہد اور کوشش واجب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ عقیدہ و ایمان تھا کہ ایک مسلمان ہوا کے رُخ پر نہیں چلتا بلکہ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے ہوئے دھارے کا رُخ پھیر دے، عالم کو اپنی راہ پر چلائے تہذیب و تمدن اور معاشرہ اور سماج کا رخ موڑ دے اور ساری انسانیت اس کے عمل و ارادہ کے تابع ہو جائے اس لئے کہ وہ اپنے پاس اس دکھی انسانیت کے لئے ایک زندہ پیام

رکھتا ہے جو اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہے اس کے پاس ایمان ویقین کی جیتی جاگتی طاقت ہے اس عالم کی رہنمائی کا وہی ذمہ دار ہے دنیا کی امامت وقیادت اسی کو زیب دیتی ہے اس عالم میں وہ صاحب امر ونہی کی حیثیت رکھتا ہے، اگر زمانہ اسے قبول نہ کرے، سماج اس کا مخالف ہو اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو تو پھر اس کے لئے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانے کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنے آپ کو غلط سماج کے سپرد کردے بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانے کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور معاشرہ اور سماج سے جنگ کرے یہاں تک کہ کامیابی و کامرانی اس کے قدموں پر آگئے، اقبال کے نزدیک "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نظریۂ زندگی ایک مرد مومن کے لئے کسی طرح صحیح نہیں۔ وہ کہتا ہے:

حدیث کم نظراں ہے تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اقبال کا خیال ہے ایک مومن زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کی فاسد قدروں سے نبرد آزمائی کرتا ہے، اس کا کام حیات انسانی کی بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح ہے اور اس سلسلے میں اسے تخریب سے بھی کام لینا پڑے تو صحیح ہے اور یہ برنبائے تعمیر واصلاح ہوگا، چنانچہ کہتا ہے:

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین وآسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اقبال کے نزدیک حالات ومصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا وقدر کا عذر پیش کرنا ایک مرد مومن کا کام نہیں اس قسم کا عذر تو وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو ضعیف الایمان اور کمزور عزم وارادہ کے ہیں مرد مومن خود تقدیر الٰہی ہے،

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال نے جب تاریخ عالم پر ایک نگاہ ڈالی تو انھیں نظر آیا کہ صالح انقلاب ہمیشہ "مرد مومن" کا مرہون منت رہا ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے اس کی مثال اس عالم کے مطلع پر ایک صبح سعادت کی سی ہے وہ انقلاب کا قاید اور زندگی کا پیغامبر ہے زندگی کی تاریک راتوں کے لئے گویا وہ صبح صادق کا موذن ہے اور اس کی اذان کی آواز عالم کے اس سکوت کو توڑ دیتی ہے جو اپنے اندر رات کی سی خوفناک خاموشی اور موت کا سا بھیانک سکون رکھتا ہے اور پھر وہ اذان اس تھکی ہاری نیند کی ماری دنیا کو ایک نشاط اور زندگی بخشتی ہے یہ وہی اذان اور بلند پکار ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوئی جس نے اس وسیع کائنات کو ایک گہری نیند سے بیدار کیا جو کہ صدیوں سے مدہوش پڑی تھی اور یہ اذان مردہ انسانیت اور پریشاں حال دنیا کے لئے ایک صور قیامت ثابت ہوئی، اور آج بھی اس اذاں میں انسانیت کو جگانے اور ضمیر انسانی کو زندہ کرنے کی وہی قوت و طاقت موجود ہے، ضرورت صرف اس مرد مومن کی ہے جو اسی روح بلالی سے پکار دے:

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق

مومن کی اذاں ندائے آفاق

اور ایک مرد مومن کی اذاں ہی اس "سحر" کو نمودار کرے گی جس سے ایک "عالم نو" انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوگا:

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

علامہ اقبال اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ایک مردِ مومن کی طاقت و قوت ، خرقِ عادت کی حیثیت رکھتی ہے اس کی طاقت کے سامنے عقلِ انسانی حیران ہے بلکہ وہ انسان کے لئے ایک معجزہ سے کم نہیں ، وہ اپنے پیغام اور اپنے ایمان و یقین سے اپنے اندر ایک نئی قوت و توانائی حاصل کرتا ہے ، اللہ تعالےٰ کی مشیت ، قدرت اور قوت قاہرہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے ، اسکے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ تو پہاڑ روک سکتا ہے اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے اقبال ایسے ہی مردِ مومن کے متعلق کہتا ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ | غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات | ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اسلامی قائد ، فاتح اندلس طارق ابن زیاد اندلس کے میدان جنگ میں اپنے پروردگار حقیقی کے حضور میں اسلامی فوج کے لئے دعا گو ہیں یہ مجاہدین اسلام اقبال کے مردِ مومن کی زندہ تصویریں ہیں :

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے | جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم اِن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا | سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو | عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن | نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

کہا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا | خبر میں ، نظر میں ، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو | وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں

اور صرف یہیں تک نہیں بلکہ اقبال کی نگاہ دوررس مردِ مومن کے پوشیدہ طاقتوں کا ذرا اور گہرائی سے اندازہ کرتی ہے ، پھر کہتا ہے :

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا | نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کے اس قول پر تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں اور بلاشبہ مومنین صادقین کی مٹھی بھر جماعت نے دشت و دریا، کوہ و صحرا کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں اور قدموں سے روند ڈالا اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے، اسلامی شہسواروں کے واقعات آج بھی تاریخ کے صفحوں پر ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سعد ابن ابی وقاص، خالد ابن ولید، مثنیٰ ابن حارثہ، عقبہ ابن عامر، محمد ابن قاسم، موسیٰ ابن نصیر اور طارق ابن زیاد کے زندہ جاوید کارنامے تاریخ عالم کے مطلع پر ہمیشہ روشن رہیں گے اور یہ اقبال کے قول کی سچی اور عملی تصویریں ہیں۔

اقبال کے نزدیک عالم میں ایک "مسلم" کی حیثیت ایک عالمی حقیقت کی ہے، رنگ و نسل اور وطن و ملک کی جغرافیائی حدود میں اسے پابند نہیں کیا جا سکتا، وہ مکان و زمان کی حدود سے متجاوز ہے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اپنے خاص انداز میں یوں ادا کیا ہے:

اسکی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور   اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل

اسکے زمانے عجیب اسکے فسانے غریب   عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل

ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق   بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اسکی اصیل

اقبال کو اس بات پر یقین تھا کہ ایک "مسلم ربانی" کا کوئی محدود وطن نہیں ہے بلکہ سارا عالم اس کا ملک و وطن ہے اس کے مشرق و مغرب کی کوئی تقسیم نہیں:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی   گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے   مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کا یہ خیال تھا کہ چونکہ ساری کائنات خدا کی ہے اور ایک "مومن" صرف خدا کا ہے اس لئے یہ ساری دنیا مرد مومن کا اپنا وطن ہے اس سلسلہ میں طارق ابن زیاد کے اس زریں واقعہ کو جب کہ اس نے اندلس کی سرسبز و شاداب زمین پر قدم رکھا تو ان کشتیوں کو جن پر کہ وہ آیا تھا جلا دینے کا

حکم دیا تاکہ پھر واپسی کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے فوج کے کچھ لوگوں کو طارق کی حرکت پسند نہ آئی انھوں نے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ہمارا وطن یہاں سے دور ہے اور ہمیں آخر واپس بھی ہونا ہے؟ اس کے جواب میں طارق کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، اس نے تلوار اپنے ہاتھوں میں لی اور کہا کہ اب واپسی کا کیا سوال؛ ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے اس لئے کہ یہ ساری کائنات ہمارے خدا کی ہے اور ہم خدا کے ہیں، اقبال کی شاعرانہ جولانی اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتی ہے:

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہ خرد خطا است
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم — ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا روا است
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت — ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

ایک "مردِ مومن" مختلف اور متضاد اخلاق و صفات کا حامل ہوتا ہے، جو اس کی طبعی رنگا رنگی اور تنوع پسندی کی آئینہ دار ہوتی ہے اور وہ مختلف و متضاد صفات دراصل اللہ تعالےٰ کے صفات و احوال کے مظاہر ہیں اور ایک "مسلم" اللہ تعالےٰ کے ان صفات کا مظہر ہوتا ہے مثلاً کشادہ قلبی، عفو و درگذر اور علم و بردباری وہ خدا کی صفت "غفار" کا پرتو ہے اور اسی طرح دین و حق کے بارے میں شدت، کفر و باطل پر غصہ و غضب اس کی صفت "قہار" کا مظہر ہے اور پاکی و پاکدامنی، پاک نفسی صفت "قدوس" کی آئینہ دار ہے، ایک مسلمان اپنے دین کا ہو بہو نمونہ اور اسلام کی سچی تصویر اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ ان تمام اخلاق و صفات کا اپنے آپ کو پرتو نہ بنالے:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اقبال کہتا ہے ایسے ہی مردِ مومن کی مثال اس روشن آفتاب کی سی ہے جس کے لئے غروب نہیں

جو ہمیشہ طلوع ہی رہتا ہے۔ اگر ایک طرف غروب ہوا تو دوسری جانب طلوع ہوا :

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اور یہ بات یقیناً سچ ہے تاریخ کے صفحات اس بات پر شاہد ہیں کہ جب کبھی عالم اسلام کے کسی حصہ پر مسلمانوں ہی کی کمزوریوں کے باعث کوئی افتاد پڑی تو فوراً ہی اس کی تلافی کسی دوسرے حصہ میں ہو گئی ۔ اگر اسلام کو عالم کے ایک حصہ میں کچھ نقصان پہنچا تو دوسرے حصہ میں اسے ایک بڑی فتح حاصل ہوئی ، اسلام کا اگر ایک ستارہ گردش میں آیا تو مطلع عالم پر ایک "نیا ستارہ" نمودار ہوا ، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اندلس کا خاتمہ ملت اسلامیہ کے لئے ایک اندوہناک واقعہ اور عظیم حادثہ تھا لیکن ساتھ ہی یورپ کے قلب پر حکومت ترکیہ کی ایک نئی اسلامی حکومت نمودار ہوئی ، غرناطہ کا سقوط اور دولت عثمانیہ کا عروج یہ دو واقعے ہیں جو ایک ہی زمانہ میں واقع ہوئے تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی تاریخ اسلام کا بڑا افسوسناک حادثہ ہے ۔ لیکن اسی زمانہ میں ہندوستان کی مسلم حکومت نے ترقی و وسعت اختیار کی اور اس انیسویں ۱۹ صدی کے شروع میں یورپ کے ہاتھوں عالم اسلامی کو سخت چرکے لگے اور یورپ کی حکومتوں نے حکومت ترکیہ کو وراثت کے طور پر تقسیم کر لیا ، لیکن ساتھ ہی سارا عالم اسلام جیسے جاگ اٹھا ، ذہنی بیداری عام ہوئی ، آزادی و حریت کا سیاسی شعور پیدا ہوا اور مختلف اسلامی تحریکیں چل پڑیں ، آج ایسا نظر آرہا ہے کہ جیسے سارا عالم اسلام ایک نئی کروٹ لینے کو ہے دیکھئے پردۂ غیب میں کیا پوشیدہ ہے ؟ تاریخ اسلامی ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے ۔ اسلام کا آفتاب اگر ایک افق میں چھپتا ہے تو دوسرے افق سے اس کی تیز کرنیں نمودار ہوتی ہیں اور یہ اس لئے کہ اسلام ہی اللہ کا وہ آخری پیغام ہے جو ساری انسانیت کے لیے شمع ہدایت ہے اس کے بعد اس عالم کے لئے اب کوئی دوسرا پیام نہیں ، اور مسلمان اس "پیام" کی حامل آخری

امت ہے اگر یہ ہلاک اور ضائع ہوگئے تو پھر وہ آخری پیغام ضائع ہو جائے گا اور انسانیت کی کشتی ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کا وجود اس کائنات میں کفر و باطل کے لئے ہمیشہ ایک "خطرہ" رہا کیا ہے۔ اور اسلام ہی وہ واحد نظام زندگی ہے جس کی بقا سارے باطل نظامہائے حیات کیلئے پیام موت ہے کافرانہ نظام زندگی اور ابلیس کی خدائی اسی وقت تک جاری ہے جب تک کہ اسلامی نظام حیات ابھر کر سامنے نہیں آجاتا اور "مرد مومن" کا کوئی گروہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ لیکن جس دن یہ امت بیدار ہوئی جس کی خاکستر میں "شرار آرزو" پوشیدہ ہے تو پھر ابلیس کی خدائی اور کافرانہ نظام حیات نقش برآب ثابت ہوگا علامہ اقبال نے اپنی بے مثال نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اس حقیقت کی اچھی نشاندہی کی ہے انھوں نے تمثیلی انداز میں یہ بات واضح کی ہے کہ آج ابلیسی نظام کو سارا خطرہ و خوف "اسلام" ہی سے ہے ابلیس کہتا ہے کہ اسلام کا آئین چشمِ عالم سے پوشیدہ رہے تو اچھا ہے کیونکہ اسی میں ہماری بقا ہے اور لبا غنیمت ہے کہ آج خود مومن محروم یقین ہے اور پھر اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ اچھا ہے انھیں الٰہیات اور علم کلام کے مباحث میں الجھائے رکھو تاکہ لباما زندگی میں ان کے تمام مہرے مات ہوں اور اسی میں ہماری خیر ہے کہ اس جہان پر اوروں کا قبضہ رہے اور مومن قیامت تک غلام رہے۔ کیونکہ:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اقبال کی یہ تمثیلی نظم ابلیس کی زبان میں اس حقیقت کی اچھی طرح پردہ کشائی کرتی ہے کہ اس عالم میں "مسلمان" ہی کا وجود کفر و باطل کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے اور اس کائنات میں پھیلے ہوئے ابلیسی نظام کو اگر کوئی خوف و خطر ہے تو وہ صرف اسلام سے ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باطل پرستوں اور ابلیس کے کارندوں نے اپنی "مسلم دشمنی" کی اس مہم میں کامیابی حاصل کی اور یہ دراصل اسلام اور اس کی آنے والی نئی نسلوں کے خلاف ایک منظم سازش تھی ۔ اِن کی سب سے بڑی کوشش یہی رہی کہ مسلمان نئی نسلوں کے سینوں میں ایمان ویقین کی جو چنگاریاں دبی پڑی ہیں انھیں جس طرح بھی ہو سکے بجھا دیا جائے اور عرب و عجم ہر جگہ ان کی جرأت دینی اور جذبۂ اسلامی کو فنا کر دیا جائے کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو ایک مسلمان کو ہر قسم کی قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ کرتا ہے بڑے سے بڑے مصائب میں بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوتی بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتا ہے ۔ اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں اس حقیقت کی طرف خوب نشاندہی کی ہے :

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا — روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات — اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج — ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے آسان اور بہتر راستہ ایسا نظام تعلیم جاری کرنا تھا جو مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ سے دینی روح ، جذبۂ اسلامی اور فکر اسلامی کو یکسر ختم کر دے ، اور ان میں ایسا مادی نقطۂ نظر پیدا کر دے جو انھیں مادی زندگی کا رسیا اور عارضی و فانی زندگی دلدادہ بنا دے ، خود اعتمادی جاتی رہے اور شک و ریب میں مبتلا ہو جائے ۔ اکبر مرحوم نے ایسے ہی نظام تعلیم کے متعلق کہا تھا :

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اقبال کی نگاہ حقیقت شناس دیکھتی ہے کہ کفر و باطل اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے دینی شعور سارے عالم میں کمزور ہو چکا ہے، ایمان کی چنگاریاں بجھ چکی ہیں، روح جہاد ختم ہو چکی ہے مادیت اور نفع پرستی کا دور دورہ ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے:

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اقبال کی طبیعت حساس کو جب مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے اور خون کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں، اور اسکی شاعری سے خون دل و جگر رواں ہو جاتا ہے، اور وہ توحید اسلامی کے اِس وارث سے شکوہ سنج ہوتا ہے:

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ

تیری نگاہ سے دل، سینوں میں کانپتے ہیں
کھویا گیا ہے تیرا، جذب قلندرانہ

اِسی قسم کا شکوہ اور دوسری جگہ بھی فرماتے ہیں:

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

تیرے محیط میں کہیں، گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اقبال کے نزدیک اِن تمام خرابیوں کا باعث مومن کا وہ قلب ہے جس سے ایمان خالی ہو چکا ہے اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہیں، کہتا ہے:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

اقبال کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کی موجودہ حالت وکیفیت عیاں ہے اور وہ اس حالت زار پر بے چین و پریشان اور شکوہ سنج بھی ہے، لیکن چونکہ اقبال یاس وقنوط کا شاعر نہیں بلکہ امید اور آس، یقین و ایمان کا "پیغام بر" ہے اس لئے وہ مایوس نہیں ہے، اُسے اس بات پر یقین ہے کہ عالم اسلام کو جو سیاسی تھپیڑے لگے ہیں، اس نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے اور ان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے اپنی مشہور نظم "طلوع اسلام" میں وہ کہتا ہے:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی

عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی نطق اعرابی

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال کی نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ مغربی تہذیب نے اپنا پارٹ اب ادا کر دیا ہے اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں، اس کے چہرے سے ضعف واضمحلال کے آثار نمایاں ہیں۔ اس عالم میں اس کا وجود اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے اس کی مثال اس پکے ہوئے پھل کی ہے جو عنقریب ٹوٹ کر گرنے والا ہو، اس کی جگہ اب ایک نئی تہذیب لینے والی ہے یہ "عالم پیر" مر رہا ہے اور ایک "جہان نو" پیدا ہو رہا ہے مگر اقبال کو اس بات پر بھی یقین ہے کہ جب تک اس جہان نو کی امامت وقیادت "مرد مومن" کے ہاتھوں میں نہیں آتی اس وقت تک یہ انسانیت اِن فرنگی مقامروں کے ہاتھوں ہلاکت وبربادی سے دوچار ہوتی ہی رہے گی ضرورت ہے کہ "مرد مومن" اٹھے اور ایک "جہان نو" کے بانی کی حیثیت سے موجودہ بیمار انسانیت کے دکھوں کا

مداوا بن کر اسے ایک نئی زندگی اور توانائی عطا کرے۔

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

مردِ مومن کا مقام

مصنف مدظلہٗ نے مولانا روم" کے تذکرے میں لکھا ہے کہ مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات، پیہم مظالم، اور مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں زندگی سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی، اور احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا تھا۔ عجمی تصوف نے فنائیت" انکارِ ذات، اور خود شکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت سے کی تھی کہ خودنگری اور خود شناسی جس پر حرکت جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے، ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول اور لوازم بشریت سے گریز، تجرد و تفرید کی تبلیغ اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا۔ عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہو گیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات و شاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرایت

کرگئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارے میں بے اعتمادی، ناامیدی افسردگی، اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی۔ اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی وسعتوں اور ترقیات سے غافل تھا مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہو گئی اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔[۱۵]

اس کے بعد مغربی فلسفہ اور یورپ کی سیاسی و ثقافتی قیادت کا دور آیا جسے نصرانی کلیسا سے رہبانیت کی میراث ملی تھی اور اس کے ساتھ ہی انسان کے بنیادی طور پر گناہ گار ہونے اور مسیح کا اس کی طرف سے کفارہ بننے کا عقیدہ بھی اس کے حصے میں آیا تھا۔ علاوہ ازیں مغربی معاشرے میں مادی تصور حیات کے تحت انسان کو پیداوار کا ایک آلہ، ایک بے جان مشین، اور ایک ترقی یافتہ حیوان سمجھا گیا جو صرف اپنے بہیمی تقاضوں کو پورا کرنا اور بازار کے لئے نفع بخش مال تیار کرنا جانتا تھا،

اس تصور میں انسان کی خیر پسندی اور تمام مخلصانہ جذبات، روحانی اقدار، اور باطنی کائنات سے قطع نظر کر کے اسے اندھی فطرت کے آگے ایک بیچاری اور بے حقیقت مخلوق سمجھا گیا تھا،

اس تصور کے نتیجے میں مشرقی مسلمانوں میں یاس و تشاؤم، انکار ذات، اپنی قدر و قیمت اور عظمت و شرافت سے وہ جہالت پیدا ہوئی جس کے بعد ان کے ہاتھوں سے قیادت کی باگ نکل گئی اور وہ مغرب کے سیاسی و ثقافتی استعمار کے سائے میں آ گئے۔

۱۵۔ تاریخ دعوت و عزیمت - ۱/۳۰۷

ان حالات نے مغربی تہذیب سے انھیں اس طرح مرعوب و متاثر کیا جیسے موم زراسی گرمی سے پگھل جاتا ہے۔ مشرق کے مسلمان سے اپنی ذات اور اپنے مستقبل پر اعتماد ختم ہو کر رہ گیا اور اسے اپنے تمام امکانات ہیچ نظر آنے لگے وہ مغرب کے مقابلہ میں مادی اور معنوی ہر طرح سے پسماندہ ہوتا گیا ایک طرف اپنی ملت اور اپنے دین پر سے اس کا اعتماد بھی اٹھا اور دوسری طرف ترقی یافتہ معاشرہ قابل فخر تہذیب، اور مضبوط حکومتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

ان مجموعی حالات و حوادث نے مشرق کے مسلمان کو وہ "مردِ بیمار" بنا کر رکھدیا جو خود اپنی ہی نگاہوں میں بے حیثیت اور اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر رہ گیا انھیں حالات میں ایشیاء اور افریقہ میں نئے سیاسی نظام، اقتصادی فلسفے، نئے ادبی رجحانات اور نئے شعر و ادب اور تنقید و صحافت نے جنم لیا اور جنھوں نے ایک ساتھ مل کر ایک ہی راگ الاپنا شروع کیا۔

ان سب ہی میں انسان کے ایمان و یقین، اور فرد کی قیمت و حیثیت سے انکار موجود تھا ان سب نے صاحب ضمیر اور صاحب ایمان انسان کے ابدی پیغام غیر مختتم امکانات و مضمرات اور اس کے اندر حالات کو بدلنے کی معجزانہ قوت سے صرف نظر کیا اس پورے نظام حیات میں مردِ مومن میں چھپی ہوئی ان طاقتوں اور مخفی صلاحیتوں سے چشم پوشی کی گئی تھی جن سے عجائب کا ظہور اور خارق عادت اوصاف کا صدور ہوتا اور جن کے ذریعہ وہ تجربات و مسلمات کو بھی باطل کر دکھاتا ہے۔

مردِ مومن کی اولوالعزمی، مہم جوئی، خلوص و بے غرضی، اس کی نزاہت و پاکیزگی مصنوعی معیاروں اور غیر حقیقی قدروں سے گریز، اور غیر فطری خوف و دہشت سے پرہیز کی قدر کسی سے نہ پہچانی جا سکی۔

مشرقی ممالک کا یہ پورا نظام مغرب کے آگے ہر حالت میں ہاتھ پھیلاتا دکھائی دیتا تھا

اور اس کی حیثیت ایک طفیلی سے زیادہ نہ تھی اس میں مغرب کے بوسیدہ نظام و پیام اور فکر و فلسفہ کو جوں کا توں لے لیا گیا تھا۔ اور اسی عموم میں شخصی اور جمہوری، اشتراکی اور اشتمالی کسی نظام حکومت میں کوئی فرق نہ تھا ان سب میں انسان اور مسلمان دونوں کے بارے میں نقطۂ نظر کا اتحاد موجود تھا جن سے خود یہ نظام قائم ہوتے تھے۔

اس جامد اور یخ بستہ ماحول میں اقبال کھڑے ہوئے اور مومن انسان کے گیت گاتے اور اس کا کلمہ پڑھتے ہیں اور اس کے اندر نخوت اور احساس عظمت، ذات کی معرفت اور خود اعتمادی کی قوت بیدار کر دیتے ہیں اسے کائنات اور عالم انسانی میں اپنے مقام سے آگاہ کر کے اور مایوسی اور ناامیدی سے نکال کر امید و آرزو، جہد و عمل، مہم جوئی اور دشوار طلبی، سیادت و قیادت، پیش بندی اور خود بینی، اعزاز و اہتزاز، اور بلند کرداری و نادرہ کاری کی دنیا میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

وہ اپنی فارسی غزل میں "مومن" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"تجھ پر مجھے کمال حیرت ہے کہ آفاق تو تجھ سے روشن ہیں لیکن تیری ذات ہی درمیان سے غائب ہے تم کب تک غفلت و بطالت، گمنامی و جہالت کی زندگی گذارتے رہو گے تمہاری روشنی نے دنیائے قدیم کو روشن کیا اور تمہارا وجود ماضی کی تاریک رات کے لئے منارۂ نور بن کر رہا۔ تمہاری آستین میں ہمیشہ "ید بیضا" موجود رہا تم آج گھروندوں میں گھوم رہے ہو لیکن تعجب معلوم نہیں کہ تم انھیں پھلانگ بھی سکتے ہو۔ تم تو اس وقت بھی تھے جب یہ کائنات نہ تھی اور اس وقت بھی رہو گے جب یہ نہ ہوگی۔ اے مرد جاودان! تو موت سے ڈرتا ہے حالانکہ موت کو تجھ سے ڈرنا چاہیے موت نہیں بلکہ تم امن کی گھات میں ہو تمہیں جاننا چاہیئے کہ

آدمی کی موت روح کی جدائی سے نہیں ہوتی بلکہ ایمان کی کمی اور یقین سے محرومی سے ہوتی ہے:

بینی جہاں را خود را نہ بینی! تا چند ناداں غافل نشینی؟
نورِ قدیمی، شب را برافروز دستِ کلیمی در آستینی!
بیروں قدم نہٖ از دورِ آفاق تو پیش ازینی تو بیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بمیرد از بے یقینی!
صورت گری را از من بیاموز شاید کہ خود را باز آفرینی[۵]

اپنی ایک دوسری نظم میں جو موسیقی کا زیروبم لئے ہوئے ہے اور جو مسلم نوجوانوں کے لئے بیداری کا ایک نغمہ ہے اس میں وہ اس "مردِ مومن" کو آواز دیتے ہیں جو مایوس و نومید ہو کر زندگی کے کارواں اور قیادت و امامت کے منصب سے بچھڑ گیا ہے وہ کہتے ہیں:

"اے خوابیدہ کلی تو اس نرگس بیدار کی طرح آنکھ کھول جس کی آنکھیں کبھی نہیں جھپکتیں اور جسے کبھی نیند نہیں آتی۔ دشمنوں نے ہمارے مستقر پر حملہ کیا ہے اور ہمیں خانماں برباد کر کے رکھدیا ہے ـــــــ کیا بلبل کی نغمہ سنجی، اذان کی للکار، اور قلب و روح کی پکار بھی تمہیں بیدار نہیں کر سکتی۔

آفتاب نے پھر از سر نو رخت سفر باندھا اور ظلمات کے سمندر میں صبحِ روشن کے پتوار حرکت میں آگئے۔ کاروانوں نے وادیٔ و صحرا میں اپنے اسباب اٹھائے اور کوچ کا نقارہ بج گیا۔ لیکن اے چشم بیدار! جو انسانیت کی نگراں، اور کمزوروں کی پاسباں تھی۔ تو ابھی تک

---

۵ زبورِ عجم ۱۶۴

سورہی ہے اور ذرا نہیں دیکھتی کہ حالات و حوادث میں کیا انقلاب آگیا؟

تیرا سمندر صحرا کی طرح ساکن ہوگیا ہے اور جوش و طغیانی کی جگہ اس میں جمود پیدا ہو کر رہ گیا ہے اس میں کوئی مدّ و جزر نہیں، اس کی موجوں میں کوئی تلاطم نہیں۔ یہ کیسا سمندر ہے جس میں نہ کوئی نہنگ حوصلہ مند ہے نہ کوئی موج بلند! تمہارے پرشور سمندر کو تو اپنے ساحل سے نکل کر دشت و جبل میں پھیل جانا تھا! اے مردِ مومن! وطن مٹی کا جسم ہے۔ لیکن روح کا وجود دین و مذہب سے ہے اس لئے تمہیں ایک ہاتھ میں "خدا کا کلام" اور دوسرے میں "تیغ بے نیام" لیکر اٹھنا چاہیئے اسلئے کہ ان دونوں کا اجتماع ہی بشریت کی سعادت ہے اور تہذیب کے لئے برکت ہے۔

اے مردِ مسلماں! تو ناموس ازل کا امین و پاسباں اور خدائے لم یزل کا راز داں ہے تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ تیری اٹھان مٹی سے ہے لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقا متعلق ہے۔ میخانۂ یقین سے پی اور ظن و تخمین کی پستیوں سے بلند ہو جا۔ فرنگ کی دلآویزی کی نہ داد ہے نہ فریاد جس نے عقل و دل دونوں کو مسحور و مخمور اور ناکارہ بنا دیا ہے فریاد ان بازیگروں سے جو کبھی ناز و انداز سے پکڑتے - اور کبھی بڑبڑیوں میں جکڑتے ہیں۔ کبھی شیریں کا پارٹ ادا کرتے - اور کبھی "پرویز" کا روپ بدلتے ہیں۔ دنیا ان کی تباہ کاریوں سے ویرانہ ہوگئی ہے اے بانیٔ حرم! اے معمار کعبہ!! اور اے فرزندِ براہیم ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لئے اٹھ اور اپنی گہری نیند سے بیدار ہو:

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز — کاشانۂ مارفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغ چمن از بانگِ اذاں خیز — از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز!

خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست — آویزہ بگوش سحر از خونِ جگر بست

از دشت و جبل قافلہ ہا رخت سفر بست | اے چشم جہاں بیں بہ تماشائے جہاں خیز!
خاور ہمہ مانند غبار سرِ راہے است | یک نالۂ خاموش و اثر باختہ آہے است
ہر ذرہ ایں خاک گرہ خوردہ نگاہے است | از ہند و سمرقند و عراق و ہمداں خیز!
دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحرا است | دریائے تو دریاست کہ افزوں نشد و کاست
بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست | از سینۂ چاکش صفتِ موج رواں خیز!
ایں نکتہ کشایندۂ اسرارِ نہان است | ملک است تنِ خاکی و دیں روح روان است
تن زندہ و جاں زندہ ز ربطِ تن و جان است | با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز!

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز! | از خواب گراں خیز! الخ

وہ اپنی ایک اردو غزل میں کہتے ہیں جو رقت و حلاوت میں اپنی مثال آپ ہے:

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی | کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے | جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی
مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں | وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی
تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری | نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا | لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

وہ اپنی ایک دوسری نظم میں کہتے ہیں جو سہل ممتنع کی ایک مثال ہے:

اے مردِ مومن! اس کائنات کے تمام مناظر و مظاہر، تمام اجرامِ فلکی اور اجسامِ ارضی زوال آمادہ اور فنا پزیر ہیں لیکن تو ان کے درمیان جاوداں ہے تمہارے ارد گرد کی ہر شئے تمہاری تابع اور ماتحت ہے لیکن تم نے اپنے کو نہیں پہچانا تم دنیا کے پیچھے کب تک چلتے رہو گے؟ یا تو اسے ٹھکرا دو یا پھر اسے اپنے آگے جھکا دو۔ درمیان کی راہ کوئی نہیں:

ہر شے مسافر ہر چیز راہی — کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی
تو مردِ میداں تو میر لشکر — نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی — یہ بے سوادی یہ کم نگاہی!
دنیائے دوں کی کب تک غلامی — یا راہبی کر یا پادشاہی[1]

یہ ایک ہلکا نمونہ تھا ورنہ اقبال کا پورا کلام ہی ان نمونوں کا حامل ہے جس میں مرد مومن اور مسلم نوجوانوں کو اس تہذیب کے خلاف ہوشیار کیا گیا ہے جس کی نگاہ میں یہ دنیا قلب و روح اور بشری امکانات کی دنیا نہیں بلکہ تجارت کی منڈی، شراب کی بھٹی اور قمار خانہ عہدوں کی کشمکش کا اکھاڑا اور قیادت و سیادت کی رزم گاہ ہے:

---

[1] بال جبریل ۷۸

ابلیس کی مجلس شوریٰ

اقبال کے آخری مجموعۂ کلام "ارمغانِ حجاز" میں ایک نادر الاسلوب نظم مذکورہ بالاعنوان سے ملتی ہے جس میں اقبال نے ایک شیطانی پارلیمنٹ کا نقشہ کھینچا اور دکھایا ہے کہ اس میں دنیا کے ابلیسی نظام کے ممتاز نمائندے شریک ہوتے ہیں اور ان رجحانات، تحریکات اور سیاسی نظریات کا جائزہ لیتے ہیں جو ان کی مہم کی راہ میں رکاوٹ اور ان کے مساعی و مقاصد کے لئے سنگ گراں ہیں اس میں ابلیس کے مشیر اپنی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں اور پھر صدر جلسہ ابلیس ان سب رایوں کو دیکھ کر ان پر تبصرہ کرتا اور اپنے وسیع تجربات اور جہاں بینی کی روشنی میں اپنی آخری رائے دیتا ہے وہ رائے ایسی ہے جس تک اس کے کسی شاگرد کی نظر نہیں پہنچتی اور سب اس پر صاد کرتے ہیں۔

اس کی رائے کا حاصل یہ ہے کہ "دنیا میں مسلمان ہی اس کا واحد مقابل اور خونی دشمن

ہے جو اسکے شیطانی نظام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے مسلمان ہی وہ چنگاری ہے کسی وقت بھی بھڑک کر آتش شعلہ فشاں بن سکتی ہے۔

اس لئے مصلحت اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی تمام طاقتیں اسی دشمن نمبر ایک کے مقابلے پر لگادی جائیں اور اگر اسے ختم نہ کیا جا سکے تب بھی اس کا زور توڑ دیا جائے یا اس پر غفلت کی نیند ہی طاری کردی جائے۔

اس نظم میں 'مسلمان' کی تصویر اس کے نازک خط و خال کے ساتھ کھچ گئی ہے اور اسکے ساتھ ہی دوسرے افکار و مذاہب و نظریات اور ان کے قائدین پر بھی روشنی پڑ گئی ہے —— نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ :

شیطان اور اس کے مشیر ایک مجلس شوریٰ میں جمع ہو کر عالمی مسائل اور مستقبل کے خطرات کا جائزہ لیتے ہیں جو ابلیسی نظام اور شیطانی پروگرام کی راہ میں آنے والے ہیں اور ان کے لئے سب سے بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شیطان کے مشیر اسلامی نظام سے پہلے دوسرے نظام ہائے فکر کا نام لیتے ہیں۔

سب سے پہلے ابلیس حاضرین کو خطاب کرتا ہے :

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں —— ساکنانِ عرش اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز —— جسنے اس کا نام رکھا تھا جہان کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب —— میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا —— میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اسکی آتش سوزاں کو سرد —— جسکے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوز دروں
جسکی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند —— کون کر سکتا ہے اس نخل کہن کو سرنگوں

اس تقریر کے بعد پہلا مشیر کہتا ہے کہ ابلیسی نظام کے استحکام میں کیا شک ہو سکتا ہے اس نے تو شاہ و گدا سب کو جکڑ ہی رکھا ہے عوام غلامی پر راضی ہیں اور اپنی پستی پر خوش و خرم ان کے دل بے ذوق ہیں جن میں کوئی آرزو سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو تمنائے خام، بن کر رہ جاتی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ ہماری مسلسل تگ و دو اور سعیٔ پیہم کا نتیجہ ہے کہ صوفی و ملا جنھیں مسلم عوام کی قیادت حاصل ہے ان کی اکثریت ملوکیت پر راضی ہو گئی ہے روحانیت، تزکیۂ نفس صفائی باطن تصوف و عرفان اور تقویٰ و احسان کو اب صوفی صرف قوالی رقص و وجد، سرود و سماع اور "حال" آنے تک محدود سمجھتا ہے اور اس کے احوال و مقامات کی دنیا اس سے آگے نہیں اسی طرح ملا یا عالم دین کا سارا علم و نظر کلامی بحثوں، الٰہیات کے مسائل، مناظروں اور الٹی سیدھی تقریروں تک محدود ہے جن لوگوں کو عوام کی دینی اور پھر سیاسی رہنمائی کرنا تھی وہ خود ملوکیت اور باطل حکومتوں کے غلام اور بندۂ بے دام بن کر رہ گئے ہیں۔ مذہب کے ظاہری رسوم کسی حد تک باقی ہیں حج و طواف کی نوبت بھی سیر و تفریح کے ساتھ کبھی آجاتی ہے لیکن وہ جہاں بانی اور حکمرانی کے تمام آداب بھلا بیٹھے ہیں اور ان کی تیغِ بے نیام کند ہو کر رہ گئی ہے اور ان کی نومیدیٔ جاوید کا یہ حال ہے کہ اب گویا حرمتِ جہاد، پر اجماع ہو گیا ہے:

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام — پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود — ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں، — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج! — صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
طبعِ مشرق کیلئے موزوں یہی افیون تھی — ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

کس کی نومیدی یہ حجت ہے یہ فرمان جدید ... ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام

دوسرا مشیر جمہوریت کو سب سے بڑا خطرہ بتاتا ہے:

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

اس پر پہلا مشیر کہتا ہے کہ مجھے تو جمہوریت سے کوئی خطرہ نہیں محسوس ہوتا، میں تو اسے ملوکیت ہی کا ایک دلآویز پردہ سمجھتا ہوں جس میں اس کا مکروہ چہرہ چھپا ہوا ہے آخر ہمیں نے تو شاہی کو جمہوری لباس پہنایا ہے اس طرح وہ ہمارا ہی پروردہ ہے۔

جب انسان ملوکیت کے جبر سے اکتا کر متنبہ اور بیدار ہونے لگتا اور اپنی عزت و خودداری سمجھنے لگتا ہے اور ہمیں اپنے نظام کے لئے جب کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو ہم اسے جمہوریت کا کھلونا دے کر بہلانے کی کوشش کرتے ہیں میر و وزیر ہی صرف بادشاہی کے نمائندے نہیں بلکہ اس کی بے شمار صورتیں ہیں، ملوکیت کسی فرد اور شخص ہی پر منحصر نہیں ہوتی۔ ملوکیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسروں کی محنت کا استحصال کرے اور جور و جبر یا حیلہ و مکر سے دوسروں کے مال و متاع پر غاصبانہ نظر ڈالے۔ اس میں فرد و جماعت کسی کی تخصیص نہیں۔ مغرب کا جمہوری نظام بھی اس سے بری نہیں اس کا چہرہ ضرور روشن ہے لیکن اس کا باطن چنگیز و ہلاکو سے زیادہ تاریک اور بھیانک ہے:

ہوں مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے ... جو ملوکیت کا اک پردہ ہو اس سے کیا خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس ... جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے ... یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ... ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام ... چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اس وضاحت اور تسلی کے بعد تیسرا مشیر اطمینان کی سانس لیتا ہے اور کہتا ہے اگر ایسا ہوتا ہے تو ملوکیت کی روح باقی رہنے سے بھی کوئی حرج نہیں لیکن اس فتنۂ عظیم کا کیا جواب ہے جو اس فتنہ پرواز اور خانہ برانداز یہودی "کارل مارکس" کی ایجاد ہے جو نبی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کامریڈوں کے نزدیک کسی نبی سے کم نہیں اس کی ذات انقلابی ضرور تھی لیکن وہ آسمانی ہدایتوں سے محرومی کے باعث کلیم بے تجلی، اور مسیح بے صلیب بن کر رہ گیا اور دنیا کو کوئی صحیح راہ عمل Way of Life نہیں دے سکا وہ ہر مذہب کا منکر اور ہر کتاب ہدایت سے باغی ہے لیکن اس کی Capital کمیونسٹوں کی نظر میں کسی آسمانی صحیفہ سے فروتر نہیں اور کمیونزم سارے مذاہب کا انکار کرتے ہوئے بھی خود ایک مذہب بن بیٹھا ہے اور دنیا میں ایک تہلکہ مچا رکھا ہے طبقاتی کشمکش پیدا کر کے امیر و غریب بورژوا اور پرولتارین کو ایک دوسرے سے لڑا دیا اور قوموں کے درمیان نفرت و عداوت کا بیج بو دیا ہے:

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب | ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیم بے تجلی، وہ مسیح بے صلیب! | نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز | مشرق و مغرب کی قوموں کیلئے روز حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد | توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کر کے کہتا ہے ساحران فرنگ اگرچہ آپ ہی کے چیلے اور عقیدتمند مرید ہیں لیکن اب مجھے انکی فراست پر کچھ زیادہ بھروسہ نہیں وہ سامری یہودی (کارل مارکس جو ایرانی اشتراکی لیڈر مزدک کی روح کا ظہور ہے) دنیا کو تہ و بالا کئے دے رہا ہے، اسنے وہ سحر کیا ہے کہ ہر چھوٹا اپنے بڑے کی پگڑی اچھالنے پر تلا ہوا ہے اور چور اچکے بھی بادشاہوں کی برابری اور ہمسری کا دعوا کر رہے ہیں ہم نے شروع میں تو اس فتنہ کو چھوٹا سمجھ کر اس کی خبر نہ لی لیکن اب اس کا

خطرہ بڑھتا ہی جاتا ہے اور مستقبل کے اندیشوں سے زمین کانپ رہی ہے آپ کی سیادت وقیادت کی بساط ہی الٹی جارہی ہے اور وہ دنیا ہی اس قیامت کی نذر ہو رہی ہے جس پر آپ کی حکمرانی قائم ہے:

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام — اب مجھے انکی فراست پر نہیں ہے اعتبار!
وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بروز — ہر قبا ہونے کو ہے اسکے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ — کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر — جسکو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے — جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

آخر میں ابلیس اپنے مشیروں کو مخاطب کر کے اپنی آخری رائے دیتا اور اپنا قطعی فیصلہ اور پروگرام سب کے سامنے رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ ان تحریکات اور نظریات سے کچھ نہیں ہو سکتا اصل عالمی اقتدار اب بھی مرے پنجۂ اختیار میں ہے دنیا کے ہر اتار چڑھاؤ اور سیاسی اتھل پتھل میں میرا ہاتھ ضرور رہتا ہے۔ جہاں میں نے قوموں اور ملکوں کو آپس میں لڑا دیا اور خصوصاً اقوام یورپ کا لہو گرمایا تو دنیا میری طاقت کا اندازہ لگا لے گی، انسان حیوانوں کی طرح ایک دوسرے پر غرّائیں گے اور بھیڑیوں کی طرح ایک دوسروں کو پھاڑ کھائیں گے میں زرا کان بھر دوں تو یورپ کے امامانِ سیاست کلیسا کے مقدس پوپ کی روحانیت اور ذہانت دھری رہ جائے اور دیوانگی اور مخبوط الحواسی کی وحشت ان پر طاری ہو جائے اور غصہ میں اندھے ہو کر مجنونانہ حرکتیں کرنے لگیں۔

اشتراکیت سے مجھے اس لئے خطرہ نہیں محسوس ہوتا کہ وہ فطرت کے خلاف جنگ کرتی ہے اور انسانوں کے درمیان جو طبعی فرق ہے اسے منطق کے زور سے مٹانا چاہتی ہے۔ یہ سر پھرے

اور لاخیرے مجھے کب ڈرا سکتے ہیں:

ہے مرے دست تصرف میں جہان رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمان تو بتو

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا شرق و غرب
میں نے جب گرما دیا اقوام عالم کا لہو

کیا امامان سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

کب ڈرا سکتے ہیں مجکو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ ہو

ابلیس سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر واقعی مجھے کسی سے خطرہ ہے تو امت مسلمہ اور ملت محمدیہ سے ہے۔ جس کی خاکستر میں نئی زندگی کے شرارے اور عزم و ہمت کے انگارے چھپے اور دبے ہوئے ہیں، جس کی رسی جل گئی ہے مگر اس کا کس بل نہیں گیا یہ امت اگرچہ جماعتی حیثیت سے پس ماندہ ہو گئی ہے لیکن اس میں باشعور و باصلاحیت افراد اور عبقری شخصیتوں کی کمی نہیں، اس کا تمّی شیرازہ برہم ضرور ہے لیکن رجال کار اور مردانِ غیب کی اس میں اب بھی کمی نہیں جو شکست کو فتح سے بدلنے، ہاری ہوئی بازی کو جیتنے اور ڈوبی ہوئی کشتی کو ترانے کی اہلیت اور ہمت رکھتے ہیں اس قوم میں ایسے اصحاب عزیمت و استقامت اب بھی موجود ہیں جن کی سحرخیزی و شب بیداری ہنوز برقرار ہے ان کی راتیں سوز و گداز، عرض و نیاز میں بسر ہوتی ہیں جو اشک سحرگاہی سے وضو کرتے ہیں اور دعائے نیم شبی اور نالۂ سحرگاہی جن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اسلئے زمانہ شناس جانتا ہے کہ اسلام ہی کل کا فتنہ اور مستقبل کا خطرہ ہے اشتراکیت نہیں:

ہے اگر مجکو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جسکی خاکستر میں ہے ابتک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں ابتک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے　　　جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے

ابلیس اپنے خیالات اور خدشات کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ امت قرآنی پروگرام کی حامل اور اس پر عامل نہیں۔ مال کی محبت، ذخیرہ اندوزی اور نفع رسانی کے بجائے نفع طلبی اور سرمایہ داری اس کا بھی مذہب بنتی جا رہی ہے مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مشرق کی رات اور اس کا مستقبل بہت تاریک ہے اور علمائے اسلام اور رہنماؤں کے پاس وہ روشنی نہیں جس سے تاریکیاں دور اور اندھیاریاں کافور ہو جاتی ہیں، ان کی آستین "ید بیضا" سے خالی اور ان کی جماعت کسی مسیحا نفس سے محروم ہے ——— لیکن زمانے کے انقلابات اور مقتضیات سے مجھے خطرہ ہے کہ وہ کہیں اس امت کی بیداری کا سامان نہ بن جائیں اور وہ پھر سے دینِ محمدی کی طرف بازگشت نہ کرنے لگے۔ "دین محمدی" اور شرع اسلامی کی ہمہ گیری اور کارسازی کا تمہیں اندازہ نہیں ——— یہ "آتشیں شریعت" خاندانی نظام، مرد و زن کے حقوق کی حفاظت و صیانت اور صالح معاشرہ کی تعمیر کرتی ہے۔ یہ دین عزت و حرمت، امانت و عفت، مروت و شجاعت کرم و سخاوت اور تقوی و طہارت کا دین ہے۔ یہ دنیا سے باطل کی ہر غلامی اور انسانوں کے ساتھ ہر ناانصافی کو مٹا کر رکھ دیتا ہے اس میں شاہ و گدا، وزیر و فقیر اور اونچ نیچ کا کوئی امتیاز نہیں اس کا نظامِ زکوٰۃ مال کے بارے میں متوازن نظریہ رکھتا ہے اور سرمایہ داروں کے مال کو بھی اللہ کی امانت اور غریبوں کا حق کہتا ہے۔ اور فکر و عمل کی دنیا میں اس نے اپنے اس نظرئے سے انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ زمین اللہ کی ہے، بادشاہ و سلاطین کی نہیں۔ اس لئے پوری کوشش ہونی چاہئے کہ یہ دین نگاہوں سے پوشیدہ رہے، اور اس کی خوبیاں چھپی رہیں ہمارے لئے یہ امید افزا علامت ہے کہ مومن خود ایمان سے محروم ہے اور الہیات و تاویلات میں الجھا ہوا ہے اس امت کو تھپکیاں دے دے کر سلائے رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جاگ اٹھے اور اپنی تکبیروں سے فسانہ و افسوں، اور

شیطانی سحر و طلسم کے تار و پود بکھیر دے۔ اس پر پورا زور لگنا چاہیئے کہ شامِ زندگی شب زندگی میں بدلے لیکن صبح کا اجالا نہ پھیل سکے۔ مومن کو جہد و عمل کی رزمگاہ سے الگ تھلگ ہی رکھو تاکہ زندگی کے ہر محاذ پر وہ ناکام ہی ہوتا رہے اور بساطِ عالم پر اپنا رول نہ ادا کر سکے، عالم اسلام کی غلامی استعمار کے لئے ضروری ہے اور اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ شعر و تصوف، توکل اور ترک دنیا کا افیون اسے دیتے رہا جائے۔ خانقاہی مزاج، اوہام و خرافات اور رسم و رواج کا یہ جسقدر پابند اور رہبانیت پر جتنا کاربند ہو گا اتنا ہی عالم کردار سے دور رہے گا ——— پھر سن لو کہ اس امت سے اور اس کی بیداری سے میں اس لئے ڈرتا ہوں کہ اس کی بیداری کا مطلب ایک قوم کی بیداری نہیں بلکہ دنیا کی بیداری کے ہیں اس قوم میں ذات و کائنات دونوں کا رشتہ جڑا ہوا ہے اور جہاں اس میں احتسابِ نفس ہے وہیں احتسابِ کائنات بھی!

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں!

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی پہ اسکے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جسکے دیں کی احتساب کائنات

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

(ارمغانِ حجاز)

شرار بولہبی در پئے چراغ مصطفوی

بالفرض اگر دنیا کی شیطانی تحریکات اور ابلیسی نظریات کامیاب ہو جاتے ہیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہ کوئی پروگرام بنانا چاہیں تو ان کے مقاصد میں سرفہرست یہی ہوگا کہ ایمان کی اس چنگاری کو بھی بجھا دیا جائے جو خاکستر ہونے کے قریب پہنچ چلی ہے ان کی سب سے پہلی کوشش یہی ہوگی کہ عرب و عجم کے دلوں سے دینی حمیت اور اسلامی غیرت کو نکال باہر کیا جائے جن کے سبب ان میں قربانی اور جہاد کا جذبہ کبھی بیدار ہو اٹھتا ہے جس سے وہ باطل سے بغاوت کر کے خدا طلبی کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم 'ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں شیطان کہتا ہے۔ جو مجاہد فقر و فاقہ سے کبھی نہیں ڈرتا اور نہ موت سے خوف کھاتا ہے...... اسے مصائب سے ڈرانے اور موت سے دھمکانے کے لئے ضروری ہے کہ روحِ محمدؐ اس کے قلب و قالب سے نکال دو اور عربوں کی مرکزیت اور ان کی سادہ فطرت و عربیت ختم کرنے کے لئے ان میں لادینی افکار و فلسفہ کی اشاعت کرو۔ اہل حرم سے ان کی دینی میراث غصب کر لو جس کے ذریعہ تم اسلام کو گہوارۂ اسلام ___ حجاز و یمن ___ سے بھی نکال سکتے ہو اور دیکھو ان شورہ پشت اور سخت جان افغانوں میں دینی غیرت ابتک چلی آرہی ہے

اس کے لئے انہیں وہاں کے علما اور دیندار طبقہ سے نمٹنا ہوگا:

لاکر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں　　زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو!
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا　　روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات　　اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج　　ملاّ کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو،　　آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز　　ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

اس مقصد تک پہنچنے کا راستہ تعلیم ہی ہو سکتی تھی جو مسلم کو اسلامی فکر و روح اور دینی جذبات سے خالی کر کے اس میں نفع اندوزی و لذتیت، دنیا پرستی اور سطحیت، مسرت کی ہوس اور دولت کی حرص، مادہ اور مادہ پرستوں کی عظمت، اخلاقی انحطاط، بے اعتمادی اور ریب و تشکیک اور بے دینی و الحاد کے جراثیم داخل کر دے جیسا کہ اکبر نے اس نظام تعلیم کی ہلاکت آفرینی کی طرف اشارہ کیا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے نہ ہوتا بدنام
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

دینداروں میں بھی دینی روح کا فقدان

اقبال کا خیال ہے کہ عالم اسلام میں باطل پسند تحریکیں اپنے اسلام دشمن پروگرام میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوتی رہی ہیں جس کے سبب دینی شعور کی کمی حرارتِ ایمانی کا ضعف، غیرتِ اسلامی کا فقدان، اور روحِ جہاد کی کمیابی عام ہو گئی۔ اور نفع طلبی اور مادہ پرستی کے سیلاب نے

عالم اسلام کے جزیرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا شاعر بلاد اسلامیہ کے مشاہدہ اور جائزہ کے بعد کہتا ہے کہ میں نے عرب و عجم میں ہر جگہ گھوم پھر کے دیکھا لیکن ابو لہب کے نمائندے تو ہر جگہ نظر آئے لیکن روحِ محمدؐ سے سرشار لوگ کبریتِ احمر اور عنقا سے بھی زیادہ کم یاب بلکہ نایاب ہیں:

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفےٰ نایاب و ارزاں ابولہب!

وہ اپنی دوسری نظم میں کہتے ہیں کہ اب بلادِ عربیہ میں اس سوز دروں کی فضا نہیں ملتی جس کیلئے عرب ہمیشہ سے ممتاز رہے ہیں اور نہ عجم میں وہ رعنائی افکار نظر آتی ہے جو اس کا طرۂ امتیاز رہی ہے گیسوئے دجلہ و فرات اگرچہ تابدار ہیں اور حق و باطل کا وہی معرکہ برپا ہے لیکن قافلۂ حجاز میں کوئی حسینؓ نظر نہیں آتا:

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں — بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات
ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں — نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

(ذوق و شوق)

اقبال مسلمانوں کی زندگی میں اس زوال و اضمحلال کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھتے اور خون کے آنسو روتے ہیں وہ اپنی نظم میں توحید کے علمبردار کی غیرت کو جھنجوڑتے ہیں اور کہتے ہیں "اے اسلامی توحید کے وارث! نہ تیرے پاس وہ کلام ساحر ہے جس سے تو دلوں کو موہ لیتا تھا نہ وہ عملِ قاہر ہے جس سے سرکشوں کو مسخر کرتا تھا کبھی تم وہ تھے کہ تمہاری نگاہ مردافگن اور صاعقہ فن تھی اور آج نہ تم میں وہ روح ہے اور نہ وہ جذب و کشش":

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں — گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ!

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے ۔۔۔ کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ،
(بالِ جبریل)

دوسری جگہ بڑے حسرت آمیز انداز میں کہتے ہیں کہ مردِ مومن کا وہ سجدۂ شوق جس سے کبھی روحِ زمین وجد میں جھوم اٹھتی تھی اور کبھی اس کی گرانمایگی سے کانپ جاتی تھی منبر و محراب مدت سے اسی سجدے کو ترس رہے ہیں اور اسی کی یاد میں تڑپ رہے ہیں ـــــــ لیکن خلاف امید مصر و فلسطین میں بھی گوشِ مشتاق اس اذان کو ترستا ہی رہا جس سے پہاڑ بھی لرز اٹھے تھے:

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی ۔۔۔ اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے ۔۔۔ دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
(بالِ جبریل)

اور کہیں تو ان جیسے رجائی شاعر کو بھی مایوس ہو کر کہنا پڑتا ہے:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ۔۔۔ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے
تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں ۔۔۔ ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف
(بالِ جبریل)

اور کہیں اس کی فلسفیانہ توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں میں حبِ صادق اور عشقِ حقیقی کی چنگاریاں باقی نہیں ہیں اور ان کے جسم میں خونِ زندگی بھی نہیں رہ گیا وہ لاشۂ بے جان بن کر رہ گئے ہیں ان کی اجتماعیت کی صفیں درہم برہم، ان کے دل ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے ان کے سجدے بے ذوق و شوق بن کر رہ گئے ہیں اور یہ سب اسلئے ہے کہ ان میں روحِ اجتماعی اور قلب کی والہانہ کیفیت نہیں:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے ۔۔۔ مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق ۔۔۔ کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

(بالِ جبریل)

نشاۃ ثانیہ

لیکن اقبال اپنی امید کیشی، آرزو مشربی اور رجائیت کے پیش نظریہ توقع ظاہر کرتے ہیں بیاسی صدمات اور مصائب اور حوادث وحالات نے اگرچہ عالم اسلامی کو گھیر لیا ہے لیکن اس سے وہ بیدار بھی ہوگیا ہے اور اس میں نئی زندگی اور تازگی کے آثار پیدا ہو چلے ہیں وہ اپنی نظم "طلوع اسلام" میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ستاروں کی کم تابی اس کی دلیل ہے کہ افسونِ شب ختم پر ہے اور پو پھٹنے والی ہے۔ اور صبح تو اس بات کی دلیل ہے کہ خورشید جہاں تاب نکلنے ہی والا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حوادث وافکار نے مسلمانوں میں جذبۂ اسلامی اور خود شناسی کا ولولہ پیدا کر دیا ہے اور طوفانِ کفر نے اس کو اپنے ایمان پر اور مضبوطی سے جما دیا ہے اور مشرق میں مغرب کے چیلنج کے اثر سے شدید ردِعمل پیدا ہو چلا ہے۔ یہ جوش ایمانی اور محبت اخوانی ابن سینا و فارابی اور جدید منطق وعقل کے دائرہ سے باہر ہے۔

اور یہ آثار ایسے ہیں کہ مسلمانوں کو شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی، اور ان کی عظمتِ رفتہ واپس ملنے والی ہے:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی! — افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونیوالا ہے — شکوہِ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی فطرتِ سیمابی اور ان کی طبیعت سراپا بے تابی ہے وہ اگر آج اس کروٹ ہیں تو کل بیداری کی کروٹ بھی لیں گے۔ ع

جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی!

ان کی نگاہ میں سرشک چشم مسلم، صرف آنسو نہیں بلکہ ابر نیساں ہے جس سے دریائے خلیلؑ میں لعل و گہر پیدا اور سیراب ہوتے ہیں، مسلمان ان کی نظر میں خدائے لم یزل کا دستِ قدرت اور زبان ہے۔ اور ستارے بھی اس کے کارواں کی گرد راہ ہیں وہ چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اسلئے جاوداں اور ازل ابد پر محیط ہے اور اس کی فطرت۔ ممکنات زندگی کی امین اور وہ ایشیا کا پاسبان ہے اسلام اور زندگی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اس لئے مسلمان کی نشاۃ ثانیہ بھی نوشتۂ تقدیر ہے۔۔

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اقبال مایوس کن مشاہدات اور تجربات کے باوجود ملت اسلامیہ سے کبھی ناامید نہیں ہوئے بلکہ اس کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے پیش نظر یہی کہتے رہے:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مسلمان، عالم نو کا بانی و معمار!

اقبال کا یہ خیال ان کے ایمان و یقین کے درجہ پر تھا کہ مغربی تہذیب اپنا رول ادا کر چکی اور اس کا وقت پورا اور اس کا ترکش خالی ہو چکا اور اب وہ بڑھاپے کی منزل میں ہے وہ اس پکے ہوئے پھل کی طرح ہے جو ٹوٹ کر گرنے والا ہے:

تاک میں مدت سے بیٹھے ہیں یہودی سود خوار   جنکی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ

دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
(بالِ جبریل)

ان کے خیال میں عالم پیر نزع کے عالم میں ہے اس کی موت یقینی ہے:

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یا اور وہ ضمیر کی موت

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ عالم قدیم جس میں یورپ کے جواری ہار جیت کی بازی لگا رہے ہیں وہ بنیاد ہی سے ٹلنے والا ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر ایک نئی دنیا کی تعمیر ہونے والی ہے اقبال کہتے ہیں کہ اس دنیا کی تعمیر بھی وہی کر سکتا ہے جس نے انسانیت کے لئے دنیا میں بیت الحرام بنایا تھا اور ابراہیمؑ و محمدؐ اس کے وارث ہوئے تھے اور دنیا کی قیادت کا علم سنبھالا تھا، اقبال مسلمانوں کو اس بار امانت کے اٹھانے کی دعوت دیتے اور انھیں بیدار و تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی مشرق و مغرب کی تباہی کا واسطہ اور کبھی خدا کی قسم دیتے ہیں اور کبھی یورپ کے پیدا کردہ عالمی بگاڑ، فساد اور انتشار کا حوالہ سامنے لاتے ہیں کہ اس نے دنیا کو بجائے امن و عافیت کے گہوارے کے فتنہ و فساد، مصائب و آلام، ظلم و ستم، آہوں اور کراہوں کا جہنم بنا دیا ہے۔ جو زمین مسجد کی طرح پاک و مقدس مانی گئی تھی اور جس میں خدا کے ذکر و فکر، تسبیح و تقدیس، حمد و ثنا کی تعلیم دی گئی تھی، اسے فرنگ نے اپنی بدطینتی سے میخانہ اور قمارگاہ، درندوں کا بھٹ، فسق و فجور، اور چوروں لٹیروں کی پناہ گاہ بنا دیا اسلئے وقت آگیا ہے کہ بانی بیت الحرام، اور حامل پیام اسلام پھر عالمی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور مغرب کے پیدا کردہ فساد کو صلاح سے، بگاڑ کو بناؤ سے اور تخریب کو تعمیر سے بدل دے اور قواعد ابراہیمی، اور سنت محمدی کے نقشہ کے مطابق دنیا کی تعمیر نو کرے۔ اقبال کا لافانی نغمہ اب بھی فضاؤں میں گونج رہا اور مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے:

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز (از خواب گراں خیز!)

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ معمارِ حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز!

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز (از خواب گراں خیز!)

اقبال کا پیغام بلاد عربیہ کے نام

اقبال نے اپنی منتخب نظموں میں سے ایک خاص نظم بلاد عرب اور امتِ عربیہ کے لئے اپنی نیک خواہشات اور محسوسات کے اظہار کی خاطر لکھی ہے جس میں ان کے فضل و شرف اسلام کی علمبرداری اور انسانیت کی دستگیری کا ذکر کیا ہے اور تاریخ کے اس عظیم اور تابناک صبح کی طرف اشارہ کیا ہے جو انسانیت کی شبِ فراق و حرماں کی صبح وصال و سعادت بن گئی،

بات سے بات نکلتے ہی اقبال اپنے محبوب خطۂ ارض میں پہنچ کر اپنی محبوب شخصیت کو یاد کرنے لگتے ہیں جس کے ہاتھوں سے اس امت کی نشاۃ ثانیہ بلکہ انسانیت کی ترقی و نجات اور سعادت کی راہ کھلی۔

یہاں پہنچ کر وہ اپنی طبیعت کو بے روک ٹوک اور قید و بند کے اس کے فطری بہاؤ پر ڈال دیتے اور زمامِ کار و طاقت گفتار قلب و روح کے سپرد کر دیتے ہیں اور پھر گل افشانی گفتا

کا سماں بندھ جاتا ہے۔

آپ امتِ عربیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں "اے وہ امتِ عربیہ! جس کے بیابان و صحرا کے لئے بھی اللہ نے بقائے دوام مقدر کر دیا ہے اے وہ عظیم قوم جس کی زبان سے تاریخ نے پہلی بار سنا کہ، قیصر و کسریٰ کا استبدادی نظام اب ختم ہوا[۱]"

وہ کونسی قوم ہے جس کے نام پہلے پہل قرآن جیسا مقدس صحیفہ اترا وہ کون سی جماعت ہے جسے اللہ نے توحید کا رازدار بنایا اور جس نے معبودانِ باطل کی خدائی سے علانیہ انکار کر کے انکی عظمت کا تختہ الٹ دیا۔ وہ کونسی سرزمین ہے جہاں وہ مشعلِ ہدایت روشن ہوئی جس سے عالم منور ہو گیا، کیا دنیا تمہارے سوا کسی اور کا نام لے سکتی ہے؟ علم و حکمت اور تمام فضائل اخلاق تمہاری دین ہیں۔ اور یہ سب ایک نبی امی (فداہ امی وابی) کی زندہ کرامت ہے جس نے اس صحرا کو چمن زار بنا دیا، جہاں حریت و مساوات کی ہوا چلی اور جہاں تہذیب نے آنکھیں کھولیں، جسم بشری بے قلب و روح تھا اسے دل و جان بخشے گئے ان کے فیض اثر سے اس کے روئے زیبا سے جہالت و جاہلیت کا گرد و غبار چھٹ گیا جس کے بعد وہ روشناس عالم ہوا۔

علوم و فنون زندہ ہوئے اور تہذیب و تمدن نے برگ و بار پیدا کئے۔ ان کے حلقہ بگوشوں میں وہ اولوالعزم فاتح، ابطال، اور قائدین پیدا ہوئے جنھوں نے حق و باطل کی جنگ میں حق و صداقت کو فیصلہ کن کامیابی عطا کی۔ انھوں نے دنیا کو وہ خدا شناس مجاہد دئے جو دن کو میدانِ جنگ کے شہسوار اور رات کی اندھیریوں میں عابد شب زندہ دار بن کر رہے۔ جنھوں نے تلواروں کی چھاؤں میں اذانیں دیں اور عین معرکۂ حرب و ضرب میں نمازِ شوق ادا کی،

---

[۱] یہ اس حدیث مشہور کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے، "اذا اھلک قیصر فلا قیصر بعدہ واذا اھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ"

بطلِ غیور صلاح الدین کی تلوار، اور زاہد کامل بسطامیؒ کی نگاہِ تقویٰ پناہ دینا اور آخرت کے لئے شاہ کلید تھی۔

اس کے پیغام کی ہمہ گیری کے نیچے قلب و دماغ اور عقل و روح دونوں جمع ہو جاتے ہیں رومیؒ کا ذکر اور رازی کا فکر اس کے سائے تلے بہم ہو جاتے ہیں، علم و حکمت، دین و شریعت بادشاہت اور حکومت سب اسی کا طفیل، اور الحمرا، اور "تاج محل" اسی کا عطیہ اس کی بعثت کا تحفہ اور اس کی عبقری امت کا ہدیہ ہیں۔ یہ شاندار اسلامی تہذیب تو اس کے ذوقِ جمال کی ایک ظاہری جھلک ہے اس کے باطنی حسن کا اندازہ تو عارفین و کاملین بھی نہیں لگا سکتے۔

وجود رحمۃ اللعالمین سے پہلے انسان ایک مشتِ خاک سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا انکی بعثت نے ایمان واحسان اور علم و عرفان سے اسے آگاہ کیا:

اے در دشتِ تو باقی تا ابد ۔۔۔ نعرۂ لاقیصر و کسریٰ کہ زد؟
رمزِ الا اللہ کرا آموختند ۔۔۔ ایں چراغ اول کجا افروختند
از دمِ سیراب آں امی لقب ۔۔۔ لالہ رست از ریگِ صحرائے عرب
حریت پروردۂ آغوش اوست ۔۔۔ یعنی امروزِ امم از دوشِ اوست
او دلے در پیکرِ آدم نہاد ۔۔۔ او نقاب از طلعتِ آدم کشاد!
سطوتِ بانگِ صلوٰۃ اندر نبرد ۔۔۔ قرأتِ الصافات اندر نبرد!
تیغِ ایوبی نگاہِ بایزیدؒ! ۔۔۔ گنجہائے ہر دو عالم را کلید!
عقل و دل را مستی از یک جامِ مے ۔۔۔ اختلاطِ ذکر و فکرِ روم و رے
علم و حکمت، شرع و دیں، نظمِ امور ۔۔۔ اندرونِ سینہ دل ہا ناصبور!
حسنِ عالم سوز الحمرا و تاج ۔۔۔ آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج

این ہمہ یک لحظہ از اوقاتِ اوست　　یک تجلی از تجلیاتِ اوست

ظاہرش این جلوہ ہائے دل فروز　　باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز (پس چہ باید کرد)

اقبال عربوں کے دورِ جاہلیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعثت محمدی سے پہلے عربوں کا کوئی نظام نہ تھا اور وہ فوضیت اور انارکی کا شکار تھے۔ ان کی زندگی جانوروں کی زندگی تھی اور کھانے پینے سے آگے ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور مقصد نہ تھا، ان کی تلوار چمکدار ضرور تھی لیکن جوہر سے خالی اور کند تھی۔ وہ اسلام سے پہلے اونٹوں کو چراتے تھے لیکن اسلام کے بعد دنیا کی جہاں بانی ان کے حصہ میں آگئی اور ان کی تکبیر جہاد سے شرق وغرب گونج اٹھے :

حق ترا برّاں تر از شمشیر کرد　　ساربان را راکبِ تقدیر کرد

کار خود را امتاں بردند پیش　　تو ندانی قیمتِ صحرائے خویش!

امتے بودی امم گردیدۂ!　　بزمِ خود را خود زہم پاشیدۂ

ہر کہ از بندِ خودی وارست مُرد!　　ہر کہ با بیگانگاں پیوست، مُرد

عربوں کی شجاعت اسلامی اور للّٰہیت کی مدح کے بعد انھیں یہ منظر غمناک کر دیتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ عربوں میں اب نشاط کے بعد پھر جمود و بے حسی، وحدت کی جگہ تفرقہ، قیادت کے بجائے تقلید و پسماندگی پیدا ہو گئی ہے تو وہ انھیں دوستانہ عتاب کے ساتھ مخاطب کرتے اور کہتے ہیں تمہارے جمود و خمود پر ایک عالم افسوس کر رہا ہے کہ دوسری قومیں کس طرح تم سے آگے نکل گئیں تم نے اپنی صحرا کی قدر نہیں کی اور اس کے پیغام کو بھلا دیا۔ تم پہلے ایک ملت ـــــ ملت مسلمہ ـــــ تھے لیکن آج ٹکڑیوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ پہلے حزب اللہ، ہی تمہاری جماعت تھی لیکن اب تمہاری جماعتوں کا شمار ہیں۔ عربوں کو معلوم نہیں کہ جو اپنی شخصیت اور حیثیت پر ظلم کرتا ہے اور اعتماد نفس کھو دیتا ہے وہ عالم وجود ہی سے مٹ جاتا

ہے اور جو اپنی چھاؤنی سے نکل کر دشمن کی پناہ ڈھونڈتا ہے وہ ذلت و بدبختی اور محرومی و ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ عربوں کا دشمن ان سے بڑھ کر اور کوئی نہیں انھوں نے خود اپنے ساتھ ناانصافی کی ہے اور روحِ رسولؐ کو تکلیف دی ہے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی روح آج امت عربیہ سے شکوہ سنج اور گلہ گذار ہے:

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد — روحِ پاکِ مصطفےٰ آمد بدرد!
اے زافسونِ فرنگی بے خبر — فتنہ ہا در آستینِ او نگر!
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد — وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقۂ دامش فتاد — آسماں یک دم اماں او را نداد

شاعر افرنگ کے مکر و فریب، ان کے خطرناک منصوبوں اور ارادوں کو خوب سمجھتا ہے اس لئے کہ اسے اس نے قریب سے رہ کر دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ عربوں کو خوش گمانی میں مبتلا دیکھ کر قدرتی طور پر متالم ہوتا ہے اور ان کی اس سادہ لوحی اور زود اعتمادی پر فریاد کرتا ہے کہ وہ انھیں اپنا نجات دہندہ اور مشکل کشا سمجھتے ہیں وہ انھیں مخاطب کر کے کہتے ہیں: غافلو! ہوش کے ناخن لو تم فرنگ پر اعتماد کر رہے ہو لیکن اس کے پوشیدہ عزائم کی تمہیں خبر نہیں تمہیں معلوم نہیں کہ سحر فرنگ نے کتنوں کو مردِ بیمار اور مجبور و گرفتار بنا کر رکھ دیا ہے تمہیں نظر نہیں آتا کہ فرنگ نے تمہاری وحدت ختم کر کے بیسیوں حکومتیں بنا دیں اور جنگوں میں ان کا کل سرمایہ لوٹ کر ایسا غارت کیا کہ کوئی غمخوار بھی نہیں ملا۔ اتنا کہنے کے بعد اقبال پھر اپنی فطری رجائیت سے کام لیے اور عربوں کو نشاۃ ثانیہ کے لئے ابھارتے ہوئے کہتے ہیں:

"تمہیں خدا نے جو بصیرت دی ہے اس سے کام لو اور دبی ہوئی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنا دو، اپنے اندر عمر بن الخطابؓ کی روح پیدا کرو۔ اور اس راز کو سمجھ لو کہ قوت کا منبع دین و ایمان

ہی ہیں جو مومن کا سرمایہ ہیں، اے صحرانشینو! جب تک تمہارے دل اسرارِ الٰہیہ کے امین ہیں تمہیں دین کے نگہبان اور دنیا کے پاسبان ہو۔ تمہاری فطرت خیر و شر کی میزان ہے، اور تم روئے زمین کے وارثِ ازلی ہو جب تمہارا کوکب اقبال مطلع مشرق سے نمایاں ہوگا تو ہر روشنی ماند پڑ جائیگی:

عصر خود را بنگر اے صاحب نظر — در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ!

قوت از جمعیتِ دینِ مبیں — دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں

تا ضمیرش رازدانِ فطرت ست — مردِ صحرا پاسبانِ فطرت ست

سادۂ طبعش عیارِ زشت و خوب — از طلوعش صد ہزار انجم غروب

عصر حاضر زادۂ ایامِ تست — مستیٔ او از مئے گلفامِ تست!

شارحِ اسرارِ او تو بودۂ، — اولیں معمارِ او تو بودۂ!

تا بہ فرزندی گرفت او را فرنگ — شاہدے گردید بے ناموس و ننگ

گرچہ شیریں ست و نوشین ست او — کج خرام و شوخ و بے دین ست او

مردِ صحرا پختہ تر کن خام را

بر عیارِ خود بزن ایام را!

صحرا کی فضائیں تمہارے لئے تنگ ہو سکتی ہیں لیکن اگر تم اپنی خودی کی تعمیر کرتے ہو تو تمہارے وجود کے آفاق بے کراں ہو جائیں گے۔ اور تم آندھی سے زیادہ تند اور سیلاب سے بڑھ کر تیز ہو جاؤ گے اور بازی گاہِ حیات میں تمہارا کوئی مقابل نہ ہوگا۔

اقبال حسرت سے پوچھتے ہیں، آخر کس نے تمہیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے کر دیا حالانکہ عصر حاضر تمہاری ہی محنتوں کا پھل اور تمہاری دعوت و جہاد کا نتیجہ ہے زمانے کی باگ جس دن سے تمہارے ہاتھوں سے نکل کر مغرب کے ہاتھوں میں آئی ہے اسی دن سے انسانیت نے اپنا وقار

اعتبار شرف و عزت اور کرامت و افتخار کھو دیا ہے۔ اور منافقت و دین بیزاری اس کا شعار بن گیا ہے۔

اے بادیہ نشیں! اور اے صحرانورد!! اپنا مقام دیکھ اور رفتار زمانہ کو روک لے، تاریخ کا رُخ موڑ دے اور قافلۂ بشریت کی اس کے مقصد اعلیٰ اور منزلِ آخر کی طرف رہنمائی کر:

بگذر از دشت و در کوہ و دمن — خیمہ را اندر وجودِ خویش زن
طبع از باد بیاباں کردہ تیز — ناقہ را سر دہ بمیدانِ ستیز
دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش — در ہلاک نوع انساں سخت کوش
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست — آبروئے خاوراں در دستِ تست
اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں — آں ید بیضا بر آر از آستیں!

(پس چہ باید کرد)

اقبال روحِ رسول ؐ سے مخاطب ہوتے ہیں اور امت کی پسماندگی اور زبوں حالی کا رونا روتے اور ایمان کی حرارت، زندگی کی حرکت کی نایابی پر آنسو بہاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام آج وطن میں اجنبی اور پردیسی بن کر رہ گیا ہے وہ روحِ محمدؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں آپ کی امت کا شیرازہ ابتر اور جمعیت برہم ہو گئی، یہ امتِ مرحوم و محروم اب کہاں جائے اور کیا کرے ---؟ بحرِ عرب اپنی روانی اور طغیانی اور جوش و خروش کھو چکا ہے اور عرب بھی اپنے سوز دروں سے خالی ہو چکے ہیں۔ اب میری تسکین و تسلی کی کیا سبیل ہو اور میرے رنج و الم کا مداوا کون کرے۔ زندگی کے طویل سفر میں آپ کی امت کا حدی خواں حیران و سراسیمہ ہے لیکن مستقبل کی منزل دکھائی نہیں دیتی للہ آپ امت کے حالِ زار پر نگاہِ کرم فرمائیں اور اس نازک گھڑی میں اس کے دست گیر ہوں:

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ لذت آشوب نہیں بحرِ عرب میں ۔۔۔ پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلۂ و راحلۂ و زاد ۔۔۔ اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ! ۔۔۔ آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟ (اے روح محمد)

حساس شاعر کو یہ بات سخت ناگوار اور اس کی ناخوشی کا باعث ہے کہ عرب باوجود مسلسل تجربات کے مغربی طاقتوں کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھیں اور ان سے اپنے مسائل و مشکلات کا حل طلب کریں اور خصوصاً مسئلہ فلسطین کے منصفانہ حل کی امید رکھیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیں کہ مغربی طاقتوں پر یہودی بری طرح مسلط ہیں اور ان کی سیاسی، اقتصادی اور صحافتی مشنری یہود کے ہاتھ میں ہے وہ کہتے ہیں کہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ جو شعلۂ حیات تاریخ میں کبھی بڑی تب و تاب سے سامنے آیا تھا وہ آج بھی عربوں کے اندر موجود ہے اور کسی وقت بھی بھڑک سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عربوں کی مشکلات کا حل لندن اور جنیوا میں نہیں بلکہ ان کی خودی کی تعمیر میں مضمر ہے۔ اخیر میں شاعر امرائے عرب سے اپنی جرأت گفتار کی معذرت کرتے ہوئے کہتا ہے "کہ عربوں سے مجھے امید ہے کہ وہ اس عجمی کی تاب گفتار کو معاف کریں گے اور اس عجمی کی حدیث زیر لبی کو اپنے معاملات میں مداخلت نہ سمجھیں گے۔" "اے اہلِ عرب! تم اس دین کے اولیں حقیقت شناس ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا قرب ابولہب سے انقطاع ہی پر منحصر ہے اور ایمان و کفر ایک دوسرے کے مقابل ہیں اسی طرح اسلام قومیت، وطنیت اور مادی فلسفوں سے بیزار اور الگ ہے اور عالم عربی سرحدوں اور سرزمینوں کا نام نہیں بلکہ محمد عربی سے انتساب اور اس دین کے تعلق کا دوسرا نام ہے":

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار ۔۔۔ اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی

نہیں وجود حدود و ثغور سے اسکا
محمدؐ عربی سے ہے، عالم عربی!

(امرائے عرب)

مسجد قرطبہ

۱۹۳۲ء میں جب اقبال نے مسلمانوں کے فردوسِ گم شدہ ـــــ اندلس ـــــ کی زیارت کی تو مسجد قرطبہ میں بھی حاضر ہوئے ـــــ یہ حاضری آثار قدیمہ کے کسی شوقین سیاح کی نہ تھی بلکہ ایک مرد مومن اور دردمند و حساس شاعر کی آمد تھی جو ایمان و عرفان کے اس پیکرِ جلیل و مظہر جمیل کے حضور میں تھی، یہ زیارت ایک عظیم مسلمان کی مسلمانوں کی ایک عظیم یادگار کے لئے تھی، اس کا مقصد اس میراث ایمانی پر آنسو بہانا تھا جو عبدالرحمٰن الداخل اور اس کے ساتھیوں نے یہاں چھوڑی تھی۔

اقبال نے اس تاریخی اور تاریخ ساز مسجد کی ساخت میں بیکراں جذبات، پاکیزہ محبت کے احساسات، فن تعمیر کی عبقریت اسلامی آرٹ کا اعجاز اور اس کی کرامت اس کی سادگی، پرکاری جمال کی رعنائی اور حسن کی یکتائی کا بڑی بصیرت سے معائنہ کیا اس منظر عبرت اثر نے مومن شاعر

کے نازک جذبات کے تار چھیڑ دئے جس کے نتیجے میں وہ لافانی نغمہ دنیا نے سنا جسے ہم "مسجد قرطبہ" والی نظم میں گونجتا ہوا پاتے ہیں۔ اقبال نے اس عظیم مسجد کو اسلام اور مسلمانوں کی تہذیبی علامت، اشارہ، اور رمز Symbol کی حیثیت سے دیکھا اس مسجد کے در و دیوار اور نقش و نگار میں انھیں مومن کے اخلاق حسنہ اور فضائل و شمائل، عالی ہمتی و بلند نظری، وسیع القلبی و عالی ظرفی سادگی اور نیک مزاجی، بلند طبعی و بلند مشربی، اخلاص و للّٰہیت، حق پسندی و عزم و ثبات، جرأت و بے خوفی، اس کی تواضع اور خودداری اور اس کے جلال و جمال کی تصویر اور اس کا ایک جامع مرقع نظر آیا،

انھیں مسجد دیکھ کر مسجد کے وہ معمار یاد آئے جنکے ذوقِ جمال حسن طبیعت، فن کاری اور صنّاعی کا یہ مسجد مرصع آئینہ ہے اور پھر ان کے افکار و پیغام کی یاد تازہ ہوگئی جس کے وہ حامل و امین اور داعی و مبلغ تھے۔ مسجد کے باعظمت و پرشوکت خوش شکل اور دیو ہیکل منارے دیکھ کر وہ اذانیں یاد آئیں جو کبھی یہاں کی فضاؤں کو مسحور کرتی تھیں اور جسے لوگ زندگی کے ہنگاموں کے اول و آخر میں ہر روز سنتے تھے اذانیں اس امت کی انفرادی آواز ہیں اور اس کے قومی ترانہ National Anthem کی حیثیت رکھتی ہیں جنکی نظیر نقار خانۂ عالم کے کسی صوت و آہنگ، نغمۂ و موسیقی، اعلان و بیان اور طرزِ اظہار میں نہیں ملتی اذان جس خطاب عام اور پیغام پر مشتمل ہوتی ہے اس کی مثال دنیا کے کسی فلسفہ و پیام، اور مذہب و الہام میں نہیں مل سکتی ان اذانوں سے کبھی قلب کائناتِ اور روح عالم کانپ اٹھتی تھی اور ایوانِ باطل کے در و بام پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔

یہی اسلامی اذان تھی جس سے دنیا میں صبح صادق کا اجالا پھیلا اور چھٹی صدی مسیحی کی گھنگھور فضائیں روشن ہوا ٹھیں، انہی اذانوں کے طفیل روشنی کی وہ کرنیں پھوٹیں جو تقدیر انسانی

کے لئے پیام تجلی بن گئیں ——— اقبال نے ان اذانوں کے تصور میں اس آسمانی پیام اور روحانی ہدایت کو یاد کیا جسے وہ اذانیں آفاقِ عالم تک پہنچاتی تھیں انھیں اس کے وہ بلیغ معانی یاد آئے جو ان اذانوں کا مطلب و مفہوم ہیں۔ اور اس تصور سے ان کا یہ عقیدہ اور پختہ ہوا کہ جو قوم اس پیام کی حامل اور اس آفاقی، اور ابدی دعوت پر عامل ہوگی وہ بھی اس نظریۂ حیات کی طرح لازوال اور غیر فانی ہے۔

اس حسین لیکن عبرت انگیز و حسرت خیز منظر، تاریخ کی اس یادگار و شاہکار، اور اس عظیم مسجد نے (جس کا منبر خطبوں سے جس کے صحن و محراب سجدوں سے اور جس کے منارے اذانوں سے صدیوں سے محروم چلے آرہے تھے) اقبال کے دل کا ایک ایک تار چھیڑ دیا اور ان کے غیر مندمل زخموں کو کرید کر اور ہرا کر دیا۔ ان کے احساسات کے سمندر میں ایمان و عرفان، ذوق و شوق، نغمات و الحان، کے ساتھ ہی آلام و احزان کی موجیں اٹھنے اور لہریں بیدار ہونے لگیں اور اس پس منظر میں ان کی عظیم نظم "مسجد قرطبہ" تیار ہوئی جس کا اکثر حصہ قرطبہ میں لکھا گیا اور سرزمین اندلس ہی میں تمام ہوئی،

اقبال نے اس میں فن و زندگی کے بہت سے نظریات و اقدار سے پردے ہٹائے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ یہ زوال پزیر دنیا فانی ہے اور اس کے ساتھ ہی قوموں کی عظیم یادگار اور آثار، اور انسانی عبقریت کے نقش و نگار اور اس کے شاہکار سب منزل فنا اور عالم بے نشانی و گمنامی کی طرف رواں ہیں، لیکن اس رسم عام سے وہ آثار اور تعمیرات مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ جنھیں کسی بندۂ با خدا، عبدِ مخلص، اور مرد مومن کا دستِ مسیحا اور پنجۂ اعجاز نما چھو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے ایمان و زندگی، اپنے مومنانہ جذبات، اور اپنی بقائے دوام کے اثر سے ان میں جان ڈال دیتا اور لافانی بنا دیتا ہے۔ اپنے عشق و

محبت[1] کی قوت و تاثیر سے انھیں زندگیٔ جاوداں عطا کرتا ہے۔

اقبال کی نگاہ میں محبت اصلِ حیات ہے جس پر موت حرام ہے، زمانہ کا سیل رواں بہت تندرو سبک خرام اور تیز گام ہے جس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی لیکن عشق و محبت اس کے مقابلے پر آ کھڑے ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ خود بھی سیلاب ہیں اور سیلاب ہی سیلاب کو تھام سکتا ہے محبت زمان و مکان کی قیود و رسوم سے بلند ہی نہیں بلکہ اس کے امکانات و مضمرات انسانی عقل سے بہت زیادہ ہیں اور اس میں ایسے آنات و ساعات اور زمان و اوقات ہیں جن کا کوئی نام و نشان بھی نہیں جانتا۔ محبت کی تجلی، آسمانی رسالتوں، اخلاقی اور نبوی تصورات سب میں مشترک ہے۔

محبت ہی سے تصویر کائنات میں رنگ و نور اور مرقع عالم میں فرح و سرور کی نمود ہے، محبت ہی وہ شراب طہور ہے جس سے سرشار ہو کر عارف سرمست اور عاشق نغمہ سرا ہو اٹھتے ہیں، محبت کبھی منبر و محراب کی نقیب، کبھی حکیم نکتہ داں، کبھی قائد جنگ و جہاد اور کبھی فاتح اقوام و امم بن کر سامنے آتی ہے محبت کے ہزاروں رنگ و آہنگ ہیں محبت ازل کی مسافر ہے اس کا مذہب کوچ اور سفر اور سیر و سیاحت ہے اور وہ ہر منزل کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے محبت ہی زندگی کی بانسری ہے جس سے نغمہ و آہنگ نکل نکل کر عالم کو مسحور و مخمور کئے ہوئے ہیں محبت ہی سے دنیا میں روشنی و گرمی، حرکت و حرارت، اور زندگی کی امنگ اور ترنگ ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

---

[1] اقبال کا عشق، مادہ سے بالکل الگ اور نفسانی شائبہ سے تمامتر پاک اور وہ ایمان و شوق اور صالح جذبات کا نام ہے۔

سلسلۂ روز شب سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز و شب، صیرفیٔ کائنات!

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار — موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات!

اول و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا — نقش کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا!

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات و دوام — جسکو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام!

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جنکا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰے — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام!

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل اسکے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات!

اس طویل تمہید کے بعد اقبال مسجد قرطبہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے خطاب کرتے اور کہتے ہیں

"اے مسجد عظیم! تو اپنے وجود و نمود میں اس پاک محبت، اور ان شدید جذبات اور پُرشوق احساسات کی رہینِ منت ہے جو ابدی اور دائمی ہیں اس لئے تو بھی دوامی اور لازوال ہے۔

جو فلسفہ خونِ جگر سے نہیں لکھا جاتا اور جس آرٹ اور فن میں فن کار کا خونِ دل شامل نہیں ہوتا اور جس شاہکار کے لئے ادیب و مصور کا موئے قلم روح کی روشنائی میں نہیں ڈوبا ہوتا وہ سطحی

مصنوعی ،اور لفظ وصوت، رنگ وروغن، اور کنکر پتھر کا ایک خالی خولی ڈھانچہ ہوتا ہے جس میں نہ جان ہوتی ہے نہ زندگی کی تازگی ورعنائی، فنی شاہکار گہری محبت، جذبہ کی گرمی اور خلوص کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ محبت ہی پتھر کے مجسمہ اور زندہ انسان میں فرق وامتیاز پیدا کرتی ہے اور محبت کا جب کوئی قطرۂ حیات پتھر پر گر جاتا ہے تو وہ بھی دل کی طرح دھڑکنے اور زندگی کا ثبوت دینے لگتا ہے اور جب اس سے انسانی دل بھی خالی ہوتا ہے تو وہ دِل، دل نہیں پتھر کی سِل سمجھا جاتا ہے۔

اقبال اثنائے خطاب میں مومن کی عظمت اور اپنی شخصیت کے بارے میں تعارفی انداز میں گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں ——— "اے مسجد عظیم! ایمان اور ذوق وشوق کی یکسانی اور جذبات کی اطاعت ہم دونوں کا مسلک ہے اور میرے تیرے درمیان ایک ربطِ نہاں موجود ہے انسان اپنی خلقت میں اگرچہ مشتِ خاک ہے لیکن اس کا دل رشکِ عرش وافلاک ہے انسانی دل بھی اشراق نوری اور لذتِ حضوری سے سرشار رہتا ہے ملائکہ دائمی سجدے کے لئے یقیناً مشہور ہیں لیکن انسانی سجدے کی لذت وحرارت ان کے نصیب میں کہاں ۔؟

اقبال اپنی برہمنیت اور ہندستانیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا فرِ ہندی، کا یہ ذوق وشوق اور اس کی قلب ماہیت دیکھ کہ گہوارۂ کفر میں نشو ونما پاکر بھی لب پہ صلاۃ و درود، اور دل میں تحیہ وسلام کی صدائیں گونج رہی ہیں، اور میں عالم مسافرت میں تجھ جیسے غریب الوطن سے مل کر سراپا شوق بن گیا ہوں تیری فطرت اور میری طبیعت میں پوری یک رنگی اور ہم آہنگی موجود ہے:

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت وبود!
رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل! — خونِ جگر سے صدا سوز وسرور وسرود!

تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز | تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
عرش معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں، | گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود!
پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا | اسکو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود!
کافر ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق و شوق | دل میں صلاۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لَے میں ہے شوق مری نے میں ہے | نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے!

اس معجزۂ فن کو دیکھ انھیں وہ مردِ مومن و کامل اور مثالی انسان Ideal Man یاد آجاتا ہے جسے اسلام پیدا کرتا ہے اور جو اس کے معاشرہ کا ایک فرد ہوتا ہے، ساتھ ہی وہ عظیم امت ان کے متخیلہ میں ابھرتی ہے جس سے ان جیسی مسجدوں کی رونق ہے۔

اقبال کی نظر میں یہ دقیع و رفیع مسجد اپنی مجموعی تصویر و تاثیر میں مومن کی تعبیر اور اس کے معنوں کی مادی تفسیر ہے۔ جلال و جمال، پختگی اور مضبوطی، وسعت و رفعت اور اپنی دلآویزی و رعنائی میں مسلمان کی ہو بہو شبیہ True Copy مسجد کے بلند و بالا ستونوں کی ہیئت سے انھیں صحرائے عرب کے وہ نخلستان یاد آتے ہیں جو اپنی کثرت و رفعت میں اس کی مثال ہیں وہ اس کی جالیوں اور جھروکوں میں ایک ربانی نور اور ایک خدائی روشنی کا ظہور دیکھتے اور اس کے بلند مناروں کو رحمت الٰہی کا مہبط اور فرشتوں کی فرودگاہ سمجھتے ہیں، اور ایمان و یقین کے جذبے سے سرشار ہو کر فرماتے ہیں کہ مسلمان بھی زندہ و جاوداں، لافانی اور لازوال ہے اس لئے کہ وہ ابراہیم و موسیٰ اور تمام انبیاء کے اس لافانی پیغام کا حامل و امین ہے جسے اللہ نے بقائے دوام اور ابدی استحکام عطا کیا ہے اور یہ امت دنیا میں جسکی داعی و نقیب ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ مسجد ملتِ اسلامیہ کے افکار و خیالات، اس کے عزائم اور معتقدات کی ایک تجلی ہونے کی وجہ سے اس کی نمائندہ ہے جس طرح یہ ملت ملک و وطن، نسل و قومیت کے

غیر حقیقی اور محدود تصورات سے بری ہے اسی طرح یہ مسجد بھی عرب عجم کے حسن امتزاج، اور آفاقی میل ملاپ کا نمونہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ مومن کا وطن، زمینی حدود سے بے نیاز اور اس کے آفاق بے کراں ہیں اور اس کے پیغام کا سوز و ساز مشرق و مغرب دونوں کو محیط ہے عراق کے دجلہ و فرات ہندوستان کے گنگ و جمن، یورپ کے ڈینوب و بحر روم اور مصر کا دریائے نیل اس کے بحر بیکراں، اور محیط اعظم کی ایک موج خوش خرام ہیں تاریخ میں اس کے شاندار اور عظیم الشان کارناموں اور فتح و ظفر کی داستانوں کی مثالیں نایاب ہیں، اسی امت نے عصر کہن کو اذنِ رخصت دے کر دورِ جدید کا آغاز اور عہدِ نو کا افتتاح کیا۔

اس امت کے افراد محبت و انسانیت کے نمائندے اور امام، اور ایمان و اخوت کے سچے نمونے اور مثال ہیں، مومن کی زبان ابر گوہر بار اور اس کے سیف و سنان جوہر دار ہیں وہ دل کا غنی، اور تلوار کا دھنی ہے، وہ میدانِ جنگ اور تلواروں کی چھاؤں میں بھی توحید و رسالت اور ایمان و توکل کا پیامبر اور خدا طلبی کی راہ میں گرم سفر رہتا ہے حق و باطل کے معرکے میں قوتِ ایمانی اس کا اوزار اور خدا پر اعتماد اس کا ہتھیار ہوتا ہے۔ وہ کس والہانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں کہتے ہیں:

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار — شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

تیرے در و بام پر وادئ ایمن کا نور — تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے — اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیلؑ

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور — اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل

اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب — عہد کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل!

ساقیٔ اربابِ ذوق فارسِ میدان شوق　　بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اسکی اصیل

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لاالٰہ　　سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لاالٰہ

پھر مسجد قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو دنیا میں مومن کے خواب کی تعبیر اور اس کی اولوالعزمیوں کی تشریح و تفسیر ہے اور خشت و سنگ اور تعمیری رنگ و آہنگ میں مومن کی روح کا ظہور تو اپنے وجود میں بتر مومن کا افشائے راز، اور اس کے لیل و نہار کا سوز و گداز ہے اور تیرے پیکر جمیل سے اس کے بلند احوال و مقامات اور ارجمند افکار و خیالات کی چہرہ کشائی ہو رہی ہے وہ کہتے ہیں کہ[1] مومن کا ہاتھ اپنی کارکشائی اور کارسازی، اپنی مشکل کشائی اور تازہ کاری، فتح و ظفر، قوت و سطوت، اور غلبہ و اقتدار کے لئے دنیا میں خدا کا ہاتھ، اور قدرتِ الٰہی کا ایک سبب ہے۔

مومن بظاہر خاکی لیکن دراصل نوری ہے اس کی ذات میں اخلاق الٰہیہ اور صفاتِ عالیہ کا پرتو اور اس کا عکس جمیل ہے اس لئے وہ دنیا سے مستغنی اور مادیت سے بے نیاز ہے اس کی امیدیں اور آرزوئیں اس کی خواہشات اور تمنائیں بہت معصوم سادی اور قلیل لیکن اس کے مقاصد و نصب العین اس کے اغراض اور پروگرام اس کا عزم و حوصلہ اس کی ہمت اور اس کا ولولہ بہت عظیم و جلیل ہیں وہ بیک وقت جلال و جمال، محبت و ہیبت کا جامع اور نرم دمِ گفتگو گرم دم جستجو، کی مثال ہے صلح و امن میں حریر و پرنیاں اور حرب و ضرب میں شمشیر و سناں! وہ صلح و جنگ ہر حال میں معصوم اور پاکیزہ شخصیت کا مالک ہے۔

اس کا ایمان وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد دائرۂ عالم گھومتا ہے اس کی ذات کائنات کی اصل و حقیقت اور اس کے سوا سب طلسم و مجاز، اور وہم و گمان ہے وہ عقل و فکر کی غایت اور ایمان و محبت کی نہایت ہے اس کے وجود سے کائنات میں خوشنمائی و رعنائی اور زندگی

---

[1] ایک حدیث قدسی بھی اس معنی کی احادیث کے ذخیرے میں ملتی ہے (مترجم)

یں قوت و بہجت کا اجتماع ہے وہ عشق کی منزل محبت کا حاصل، اور جسم وجود کا دل ہے:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اسکے دلوں کی تپش اسکی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم — اس کا سرور اسکا شوق اسکا نیاز اسکا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اسکا دل بے نیاز!
اسکی امیدیں قلیل، اسکے مقاصد جلیل — اسکی ادا دلفریب اسکی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین — اور یہ عالم تمام وہم طلسم و مجاز!
عشق کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمئ محفل ہے وہ

وہ دوبارہ معبد قرطبہ سے مخاطب ہوتے اور کہتے ہیں کہ تو ارباب فن کا کعبہ نیازمندان عشق کا قبلہ اور اسلامی عظمت کا نشان ہے تیری وجہ سے اہل نظر کی نظر میں سرزمین قرطبہ فلک منزلت اور حرم مرتبت ہوئی، تیری رعنائی و برنائی، دلکشی اور دل کشائی کی اگر کوئی مثال سکتی ہے تو صرف قلب مسلم اور دل مومن میں ——— اقبال یہاں پہنچ کر بے اختیار ہو جاتے ہیں اور ماضی کی طرف والہانہ دیکھتے ہیں اور تخیل کے پروں سے اڑ کر صدیوں کی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلامی دور کے اندلس میں پہنچ جاتے ہیں، اور رومانویت و کلاسکیت کو فکر و فن کا جامہ پہناتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ وہ مردانِ خدا، اور ارباب صفا، خلق عظیم و لطف عمیم کے جامع اور صداقت و اسلامیت کے حامل عربی شہسوار کہاں گئے۔ اور ان کا قافلۂ سخت جاں، عشقِ شور انگیز کی کس منزل میں ہے؟ وہ عرب خلفا اور حکمراں کہاں گئے جنکی حکومت، خدمتِ انسانیت کا دوسرا نام اور جنکی بادشاہی و جہانگیری رفاہِ عام و فلاحِ عوام تھی جو مشرق و مغرب کے

مربّی اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بانی تھے اور جن کی بصیرت کی روشنی یورپ کے قرونِ مظلمہ Dark Ages کے لئے روشنی کا مینار کا حکم رکھتی تھی۔ اور جن کا وجود یورپ کے لئے پیامِ رحمت بنا ہوا تھا۔

اقبال کہتے ہیں اسپین میں باوجود مغربیت کے عربی خون کی لالہ کاری اس کی چمن بندی میں مصروف ہے اور اندلسیوں میں آج بھی عربوں کے اثر سے روح کی لطافت و خوشدلی، مہماں نوازی و گرمجوشی، سادگی اور مشرقیت کا جمال باقی ہے خوشبوے یمن سے آج بھی اسکی ہوائیں معطر، اور فضائیں معنبر ہیں، اور آہنگ حجاز و عراق کی صدائے بازگشت وہاں اب بھی سنی جا سکتی ہے:

کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبین ... تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر ... قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار ... حاملِ خلقِ عظیم، صاحبِ صدق و یقیں
جنکی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب ... سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جنکی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب ... ظلمتِ یورپ میں تھی جنکی خرد راہ بیں
جنکے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی ... خوشدل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال ... اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں
بوئے یمن آج بھی اسکی ہواؤں میں ہے ... رنگ حجاز آج بھی اسکی نواؤں میں ہے

ماضی کی ان حسرتناک یادوں کے بعد وہ انقلاب کی تمنا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اندلس کی سرزمیں ہمدوشِ فلک ہوتے ہوئے بھی صدیوں سے اذانوں سے محروم چلی آرہی ہے اور باجود اس کے کہ عالم میں انقلاب کی ہوا چل رہی ہے یہاں صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی!

جرمنی میں لوتھر کی تحریک تجدید و اصلاح **Reformation** کا ظہور ہوا جس نے تہذیب و ثقافت اور علم و ادب دونوں کو متاثر کیا اور پوپ کی عصمت اور کلیسا کی وہ عظمت دلوں میں نہیں باقی رہ گئی۔ آزاد خیالی کی رو نے فکر و فلسفہ کو تقلیدی بندھنوں سے آزاد کر دیا، یورپ میں نشاۃ ثانیہ **Renaissance** کی تحریک نے ہر طرف نئی زندگی کی لہر دوڑا دی، روسو اور والیٹر کے زیر اثر انقلاب فرانس نے صنعتی دور کو جنم دیا اور قدامت پرست روما بھی انقلاب کے لئے تیار ہو گیا۔[۱]

اس پس منظر میں اقبال اسلامی انقلاب کی تمنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی انقلاب کی روح بے چین ہے لیکن کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی وہ بڑے رومانی انداز میں قرطبہ کی نہر وادئ الکبیر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیرے کنارے کوئی غریب الدیار، ماضی کے آئینے میں مستقبل کو دیکھ رہا ہے۔ اور آنے والے زمانے کا تصور اتنا حیرت زا ہے اور یورپ کے لئے اتنا ناگوار کہ یورپ میری صاف گوئی اور دور اندیشی کو صبر و سکون کے ساتھ نہیں سن سکتا پھر وہ اپنا نظریۂ حیات واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انقلاب، تجدید اور خیر و شر کی کشمکش سے قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ ہوتا رہتا ہے۔ کارگاہ حیات میں جو قومیں پھونک پھونک کر قدم رکھتیں اور اپنے ہر نفس کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں وہ زندگی کی مستحق قرار پاتی ہیں اور دنیا میں ان کا وجود فیصلہ کن طاقت بن جاتا ہے آخر میں شعر و ادب اور فکر و فن کے بارے میں اپنی منفرد رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو فلسفہ خونِ جگر سے نہیں لکھا جاتا اور جو صرف دماغ سوزی کی پیداوار ہوتا ہے اس میں زندگی نہیں ہوتی۔ اور ہر وہ فنی شہ پارہ فنا پزیر اور سریع الزوال ہے جس میں

---

[۱] یہ نظم دوسری جنگ عظیم سے پہلے کہی گئی تھی جب مسولینی نے اہل اطالیہ میں قومی فخر و نخوت کی روح پھونک دی تھی اور اٹلی فاشزم کی راہ پر چل پڑا تھا۔

فن کار کا خونِ دل شامل نہیں اور وہ نغمہ جاوداں نہیں بن سکتا جس میں نے نواز کا سوزِ دروں اور دل کی آنچ نہیں، جو دل کی گہرائیوں سے نہیں پھوٹتا ——— یہ نظریۂ فن نہیں بلکہ نظریۂ حیات بھی ہے۔ ادب و زندگی دونوں کے لئے خونِ دل و جگر ہمیشہ ضروری رہا ہے:

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں — آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے — عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دین — جسنے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا — گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا
وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب — لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ مری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب!
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

(بالِ جبریل)

نظم پر ایک عمومی تبصرہ[1]

اگر اقبال کی چند منتخب اور نمائندہ نظموں کا نام لیا جائے تو مسجد قرطبہ ان میں سے ایک اور سرفہرست ہوگی، اور شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اقبال کے فن و شخصیت، اور ان کے مجموعی ورثے میں یہ نظم ان کے واحد شاہکار کا حکم رکھتی ہے اور اردو ادب کے ناقدین کا متفقہ فیصلہ بھی اسی خیال کے حق میں ہے۔ نظم کے مختلف حصوں میں شاعر بڑے حسنِ ترتیب کے ساتھ اپنے خیالات کو سامنے لایا ہے۔ پوری نظم بتدریج اپنی انتہا اور ارتقا کو پہنچتی ہے اور بیچ بیچ میں اگرچہ جملہ معترضہ اور مختلف موڑ Climexes بھی آتے رہتے ہیں لیکن ان کی حیثیت سنگ میل اور نقش و نگارِ راہ گزر ہی کی ہے۔ اور وحدتِ اثر اور مجموعی تاثر کے لحاظ سے یہ نظم بھی ہے اور مختلف سلسلۂ ہائے خیال اور حلقہ ہائے فکر کی یکجائی کے اعتبار سے غزلوں کا مجموعہ بھی (اور ایسا اقبال کی تمام نظموں میں ہوا ہے کہ ان کی نظم کئی غزلوں کا مجموعہ ہوتی ہے) سب سے پہلے نظم کے تدریجی ارتقا اور فطری دروبست اور ترتیب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جذبات و خیالات کی ابتدا، عروج اور خاتمہ اور ان کے درمیانی اتار چڑھاؤ کو اپنی طبعی حالت پر برقرار رکھا ہے اور فکر کو جذبے سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے نظم کی تمہید سلسلۂ روز شب پر ایک فلسفیانہ نظر اور تاریخ کے واضح شعور کے پس منظر میں شروع ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عشق و ایمان کی قوت کائنات کی استثنائی طاقت ہے جس پر زوال و فنا نہیں عشق و ایمان وہ پارس پتھر ہیں جو مٹی کو سونا اور یہ آبِ حیات فانی کو غیر فانی بنا دیتا ہے اقبال نے تاریخ فلسفہ میں شاید پہلی بار اتنی وضاحت اور یقین کے ساتھ فلسفہ تاریخ کے اس پہلو پر زور دیا ہے کہ مرد خدا کا عمل (رنگِ ثبات

---

[1] از مترجم

ودوام لئے ہوتا ہے اور اسکا عمل عشق سے صاحب فروغ ہوتا ہے) یعنی عالمی سچائیوں اور عالمگیر اقدار وحقائق کی طرح ایمان ویقین اور عشق ومحبت کے انسانی جذبات بھی لافانی ہوتے ہیں اور کسی عمل میں ان کے سبب رنگ دوام پیدا ہو جاتا ہے اب فلسفہ سائنس میں بھی یہ نظریہ مسلمہ بن گیا ہے کہ اصل حیات اور اساس وجود ذہن Mind ہے نہ کہ مادّہ Matter یعنی معنوی اقدار ہی کائنات میں فیصلہ کن ہستی رکھتی ہیں ذہن وخیال اور جذبۂ وفکر ہی حقیقی وجود رکھتے ہیں اور مادّی نقوش صرف اس کا ظہور ہیں اقبال بھی فلسفہ کے اسی روحانی مکتب فکر کے حامی تھے ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسجد قرطبہ کے خشت وسنگ فنا پزیر ہو سکتے ہیں لیکن اس کا معنوی وجود اس کا پیغام اور اس کے پیچھے چھپا ہوا جذبہ وایمان، اس کے معماروں اور بانیوں کا عشق وخلوص زندہ جاوداں ہے۔ مسجد قرطبہ زمانے کے حوادث کا شکار ہو سکتی ہے اور اس کا ظاہری وجود مٹ سکتا ہے لیکن تاریخ...... انسانیت میں اس کا نام انمٹ ہے اور جریدۂ عالم پر اس کے لئے بقائے دوام کی مہر ثبت ہو چکی ہے اقبال کا کہنا ہے کہ چیزوں کی قدر وقیمت کمیّت Quantity میں نہیں بلکہ کیفیت Quality میں ہے اور فانی سے فانی چیز ابدی حقائق سے مل کر لافانی بن جاتی ہے مسجد قرطبہ کے ان معنوی اسباب دوام کے ذکر کے ساتھ مرد مومن کی باطنی صفات اور ذاتی خصوصیات کا تذکرہ ناگزیر اور فطری تھا چنانچہ اقبال نے اپنے مرد مومن اور انسانِ کامل کا پورا تعارف کرایا اس کے ایمان وخلوص روحانیت ومحبت اور جلال وجمال کی تصویر کشی کی اور اپنے فلسفہ خودی کے بنیادی نکات کو ایمانی صفات کا رنگ دیدیا اور پھر تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے مستقبل تک پہنچ گئے اقبال کا اس نظم میں سب سے بڑا فنی کمال یہ ہے کہ موضوع اگرچہ یاس انگیز وحسرت خیز اور یکسر قنوطی تھا لیکن اقبال نے اسے پورے طور پر رجائی انداز سے ٹچ Touch کیا ہے اور ان کا طرز استدلال Approach مکمل طور سے خوش آئند وبشارت آمیز ہے نظم کی دوسری بڑی خصوصیت

یہ ہے کہ اسکے آفاق اور اس کا دائرہ تخیل بہت ہمہ گیر اور محیط اور اس کا Canvas بہت وسیع اور اس کے پس منظر کا تاریخی شعور بہت طویل و عریض ہے اور تقریباً فتح اندلس سے لیکر زمانۂ حال تک کے تاریخی حوادث و انقلاب اور فکر و فلسفہ کے اہم تحریکات کا ذکر آگیا ہے اس کے ساتھ ہی اقبال کا نظریۂ حیات و کائنات، ان کا فلسفۂ خودی مردِ مومن کا تخیل ایمان و عشق کے بارے میں واضح تصورات، ان کا فلسفہ تاریخ، ان کا نظریۂ شعر و ادب، فنونِ لطیفہ کے بارے میں ان کا طرزِ عمل زندگی کے تخلیقی و تحریکی عناصر اور ان کے علاوہ بہت سے واضح نظریات اس نظم میں آگئے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کے آئینے میں ہم اقبال کی ہشت پہل شخصیت کے خط و خال دیکھ سکتے ہیں اور ان سے مل سکتے ہیں!

ذوق وشوق

۱۹۳۱ء ۱۳۵۰ھ کی ایک حسین صبح تھی جب موتمر اسلامی کا قافلہ بیت المقدس کی مبارک و منور فضاؤں میں داخل ہوا۔ تمام ماحول کیف آور اور ہوا روح پرور تھی آفتاب جہاں تاب کی سنہری کرنیں اس طرح ابھر رہی تھیں جیسے وہ نور کے چشمہ سے نکلی ہوئی نہریں ہیں۔ طلوع آفتاب کا منظر اور صبح کا سہانا سماں ہمیشہ سے شعرا کے لئے ذوق پرور اور نشاط و انبساط کا باعث رہا ہے۔ جس سے وہ قلب و نظر کی زندگی اور فکر و خیال کی تر و تازگی کا سامان پاتے رہے ہیں۔

مکان و زمان کے حسن و جمال نے ہمارے عظیم شاعر و فلسفی ڈاکٹر محمد اقبال کو (جو یورپ سے اسلامی ہند کی طرف سے مؤتمر میں نمائندگی کرنے آرہے تھے) بہت متاثر و مسحور کیا انھوں نے بڑے انہماک اور غور سے ان دلفریب و دلکشا مناظر کو دیکھا اور دامِ نظر کو اس ارض رنگ و بو کی گلچینی کے لئے پھیلا دیا۔ متاعِ نگاہ کو دل کی راہ میں لٹا کر قلب و روح کی تسکین و تسلی کا

سروسامان کیا۔

اقبال کے لئے سرزمین فلسطین پر رنگ برنگ کے اڑتے ہوئے بادل، وہاں کے سبزپوش پہاڑ، وہاں کے سرو سمن نسیم صبح کی خوشخرامی، رات کی بارش سے دھلے ہوئے برگ نخیل اور وہ ریگ رواں جوزمیں پرحریر و پرنیاں ہو، یقیناً دلچسپی کا باعث ہوئی ہوگی، ان کی نگاہوں کے سامنے عربوں کی سادہ زندگی کے مناظر۔ بجھی ہوئی آگ، خیمے کی ٹوٹی ہوئی رسیاں، اور اکھڑے ہوئے خیموں اور چھولداریوں کا نشان گذرے ہوئے کاروانوں کی خبر دے رہے تھے وہ اس حسن فطرت اور اس جنتِ ارضی سے اسقدر خوش ہوئے کہ وہیں طرح اقامت ڈالنے کی خواہش کی پیغمبروں کی اس سرزمین کے مناظر نے (جیساکہ وہ ہمیشہ کرتے آئے ہیں) اس موقع پر بھی شاعر کے مہوئے جذبات اور ناآسودہ آرزوں اور تمناؤں کو ایک بار پھر جگا دیا اور احساس کی شدت نے اسلام اور مسلمانوں کی محبت کو صوت و نغمہ کا آہنگ بخشدیا۔ اور یہ دل سے لگا ہوا محبوب موضوع انکے احساسات کی فضا پر چھا گیا اور ان کی توجہات و میلانات کا واحد مرکز بن گیا۔ اور ان کو وہی صورتِ حال پیش آئی جو عرب شاعر کے سامنے آئی تھی اور جسے اس نے کہا تھا:

ولما نزلنا منزلاً طلہ الندیٰ　　انیقاً وبستاناً من النور حالیاً

اجدّ لنا طیب المکان وحسنہ　　منیً فتمنینا، فکنت الامانیا

(جب ہم شبنم سے شاداب مقام اور گل و غنچہ سے مہکے ہوئے باغ میں اترے تو حسن مقام نے ہمارے دل میں چند آرزوئیں پیدا کردیں اور ان آرزوں کی جان تمہیں تھے)

وہاں ان میں وہ بلند خیالات و احساسات پیدا ہوئے جو زمان و مکان کی سرحدوں سے پرے اور حد درجہ غیر معمولی تھے۔ انھوں نے اندازہ کیا کہ یہ عالم پیر اُن کے تازہ دم اسلامی جذبات و خیالات کی تاب نہیں لاسکتا، اور اس کا جامد اور تقلیدی ذہن آئے دن قومیت و

وطنیت جنس و جغرافیہ اور رنگ و نسل کے بت تراشتا اور پوجتا رہتا ہے اور خواہشات و نفسانیت کے لئے حیلے تلاش کرتا رہتا اور انھیں تقدس کا رنگ دیتا ہے۔ یہاں انھیں اس دور جدید کا ابراہیم یاد آتا ہے جو اٹھے اور اٹھ کر دنیا کو ان اصنام خیالی سے پاک اور خالی کر دے۔

اس موقع پر وہ عالم اسلام کو دیکھتے ہیں تو وہاں ظاہری افلاس و پسماندگی کے ساتھ ہی عقل و شعور اور فکر و وجدان کا فقدان اور ذہنی افلاس نظر آتا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ عالم عربی بھی ایمان و عقیدہ کی پختگی، اور روح و جذبہ کی برشتگی کھو چکا ہے اور عرب کے ساتھ عجم بھی جدت افکار سے محروم ہو چکا ہے اور موجودہ مادی نظام بھی کسی انقلابی مرد خدا کے انتظار میں ہے جو حق و صداقت کا عالمی رول ادا کرے اور حالات کو یکسر بدل دے اور حسینؓ ابن علیؓ کا حق پسندانہ کردار ایک بار پھر تازہ کر دے عالم اسلامی اس انقلاب کے لئے عالم عربی کی طرف توقع کی نظریں اٹھائے ہوئے ہے اور دنیا گہوارۂ اسلام ـــــ حجاز ـــــ کی طرف حسرت سے دیکھ رہی ہے لیکن اس کی دستگیری کے لئے کوئی ہاتھ نہیں بڑھتا اور ساحل دجلہ و فرات پر کوئی کربلائے حق نہیں ظاہر ہوتا۔ انسانیت کی پکار پر کسی طرف سے لبیک کی صدا اور عالم اسلامی میں کوئی مرد خدا نہیں دکھائی دیتا۔

یہاں پہنچ کر اقبال اس جمود و انحطاط کا سبب عالم اسلام کی دینی غیرت اور ایمانی جوش و محبت کی کمی قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ عقل و دل و نگاہ ہر چیز کو محبت کا خادم اور عشق کا مصاحب و ملازم ہونا چاہئے اور دین کی بنیادوں کو ایمان و محبت کے عناصر سے مضبوط کیا جائے جب تک دین کے ساتھ مسلمانوں کا جذباتی لگاؤ اور ان کے عشق و محبت کا جھکاؤ نہیں ہوتا دین صرف مظاہر و رسوم اور بے جان احکام کے مجموعے کا نام رہے گا جو زندگی کی توانائی اور اس کی رعنائی و برنائی سے خالی اور اثر و نفوذ سے عاری ہوتا ہے

اقبال کی نگاہ میں معجزات و خوارق کا ظہور عشق ہی کے ہاتھوں ہوتا ہے، عشق کبھی صدق خلیلؑ ہے کبھی صبر حسینؓ اور کبھی غازی بدر و حنین!

قلب و نظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں — چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود — دل کیلئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب — کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے — ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر — کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی،
اہل فراق کے لئے عیش دوام ہے یہی!

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات — کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں — بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات!
ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں — نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات!
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

پھر شاعر اپنے انسانِ کامل اور مرد مومن، کی طرف متوجہ ہوتا اور اسے خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا وجود کائناتی وجود کی غایت اولیٰ ہے تو ہی رازِ کُن فیکون ہے تو ہی وہ فردوس گم شدہ اور متاع رلبودہ ہے جس کی آرزو اور جستجو میں روحِ عالم سرگرم سفر ہے۔

اس کے ساتھ ہی عالم اسلام کے حقیقت پسندانہ جائزے سے شاعر دل گرفتہ نظر آتا ہے کہ وہاں کوتاہ نظری، بے ذوقی، اور رجال دین کی کم ہمتی اور ذہنی و وجدانی بے بضاعتی عام ہے۔ دانشکدوں اور درس گاہوں اور دینی تعلیم کے مرکزوں میں بھی نظر کی گہرائی و گیرائی، ذوق کی صحت بیدار مغزی اور وہ عالی ظرفی و بلند مشربی عنقا ہے جو ان اداروں کا امتیاز تھی۔ اور جو آج عالم اسلام کی قیادت کے علمبردار ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں اس شعلۂ حیات کے پیچھے سرگرداں ہوں جس نے کبھی زندگی کو تب وتاب اور نور و سرور بخشا تھا۔ میں ان ابطال کو ڈھونڈتا ہوں جو ماضی کے دھندلکے میں گم ہو گئے ہیں۔ اور اس آتش رفتہ کے سراغ میں ہوں جو زمانے کی خاکستر میں چھپ گئی۔

اقبال کو اپنے کلام و پیام کی اہمیت کا اندازہ ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ بادِ صبا خس و خاشاک کی پرورش کرتی ہے لیکن میری مسیحا نفسی دلوں کے لئے ذوق و آرزو کا پیام ہے اور یہ اثر و نفوذ اس لئے ہے کہ میری نواؤں میں خونِ دل و جگر شامل ہے اور میری رگِ نے میں میرا لہو رواں دواں ہے:

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو — نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق — خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ — میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس — میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو
خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش — ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو!

فرصت کشمکش مده ایں دل بیقرار را
یک دو شکن زیاده کن گیسوئے تابدار را

اس تخاطب سے خدا کی طرف گریز ہوتا اور شاعر کے ذوق وشوق کا رخ بارگہِ قدس کی جانب ہو جاتا ہے اور مقام عبدیت سے شاعر اپنے محبوب ومعبود کے حضور اس طرح لب کشا ہوتا ہے کہ تیری تجلی کائنات کو محیط ہے اور دنیا تیری قدرت کے صحرائے بیکراں کا ایک ذرّہ اور وجود و زندگی، تیرے وجود لامحدود کے بحرِ بے پایاں کا ایک قطرہ ہیں۔ تیرے نور کی تجلی سے ذرہ میں آفتاب کی نمود اور قطرہ میں سمندر کا وجود ممکن ہو جاتا ہے۔ تیرے جلال کے ظہور سے سلاطینِ عالم اور فاتحین اقوام وامم کی ہستی مستعار اور تیرے جمال کے نور سے زاہدوں عابدوں، اور نوع انسانی کے محسنوں کے دل سرمست وسرشار ہیں وہ کہتے ہیں تیرا شوق ہی میری روح کا حدی خواں اور میرے دل کا ترجمان ہے اور وہی میری عبادت اور میری نماز میں لذت وروحانیت پیدا کرتا ہے اور جب وہ اس ذوق وشوق سے خالی ہوتی ہے تو حضوری کے بجائے دوری ومہجوری اور وصال کی جگہ بعد و انفصال کا پیام بن جاتی ہے عشق وعقل دونوں ہی کو حسب توفیق غیاب وحضور کی خدمت سپرد ہوئی عقل کو بحث وجستجو، غور وفکر، اور اعتماد نفس وخودداری ملی اور عشق کو اضطراب والتہاب شورش وسوزش، ذوق وشوق اور لذتِ حضوری میسر ہوئی دنیا میں پھیلی ہوئی روشنی نورِ آفتاب کے سبب نہیں بلکہ تیرے جمال جہاں آرا اور حسن گیتی فروز کا پرتوِ فیض ہے۔

آخر میں اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی طویل علمی تحقیقات، عالم سعادت کا فتح باب نہ کر سکیں اور اخیر میں یہ کھلا کہ تمام علم وعرفان لاحاصل اور بے نتیجہ تھے جس طرح یہ سمجھنا نادانی ہے کہ علم نباتات کا ماہر تازہ پھلوں کا ذائقہ شناس اور اس کا لذت آگاہ ہے۔

مادیت اور روحانیت کی یہ کشمکش ہمیشہ سے جاری اور حق وباطل کا معرکہ شروع سے قائم ہے تاریخ اسلام بھی اس سے خالی نہیں وہ اس موقع پر پہلے معرکے کو یاد کرتے ہیں جس میں ابوجہل وابولہب اور اس کے خلفاء مادیت کے علمبردار اور سرور عالمؐ اور ان کے انصار رایت ایمانی

کے حامل وجلودار تھے اب عالم عربی اور دنیائے اسلام کا اس میں امتحان ہے کہ وہ ان دونوں متقابل فریقوں میں سے کس کی حمایت وطرفداری کرتا ہے:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب　　گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ　　ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود　　فقر جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام　　میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے　　عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب　　مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　　عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب
گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد　　عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب
عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　　وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب
عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا　　گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب
گرمیٔ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق　　موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

(بالِ جبریل)

ذوق و شوق پر ایک سرسری نظر[1]

یہ نظم بھی اقبال کی چند ممتاز نظموں میں ہے اور مسجد قرطبہ کا انداز اس میں بھی بڑی حد تک

---

[1] اضافہ از مترجم

برقرار ہے تمہید میں مناظرِ فطرت اور جمالِ قدرت کا بیان اور عربوں کی سادہ اور دلکش زندگی کی داستان بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے بیان ہوئی ہے اور پھر سوز و ساز، ذوق و شوق، عقل و عشق، مومن کا جلال و جمال، خدا کی عظمت و رفعت کا کمال اور وصل و فراق کا موازنہ اور ان پر تبصرہ سب کچھ آگیا ہے اور نظموں کی طرح اقبال کی فنی مہارت و چابکدستی اور بلیغ منظر کشی و سماں بندی کہ حالات و واقعات کی تصویر نگاہوں میں پھر جائے اور قالؔ حالؔ اور خبر نظر بن جائے اس نظم میں بھی موجود ہے اقبال اپنی تہ رسی اور دقیقہ سنجی، دروں بینی اور بالغ نظری سے ملکوں، تہذیبوں، مذہبوں، اور قوموں کی روح میں اتر جاتے ہیں اور پھر اپنا ذاتی مشاہدہ اور صداقت کا تجربہ و تجزیہ شعر و نغمہ کے پردوں کی آڑ میں ہوبہو سامنے رکھ دیتے ہیں۔ وہ مغرب کی نبض شناسی کے ساتھ ہی مشرق اور ایشیا کے بھی واقف اسرار و دانائے راز ہیں وہ جس طرح عجم کے حسنِ طبیعت کے رمز آشنا ہیں اسی طرح عرب کے سوزِ دروں کے نکتہ شناس بھی ہیں وہ ہندوستان و ایران، عرب و افغانستان اور مشرق و مغرب کے مزاج، مذاق اور طرز و انداز و افتادِ طبع اور ان کی فطرت سے پوری طرح آگاہ ہیں وہ اس نظم میں فلسطین اور عرب کی منظر کشی کے ساتھ اس کے روح و پیام پر بھی لطیف تبصرے اور اس کی طرف نازک اشارے کرتے گئے ہیں بجھی ہوئی آگ اور ٹوٹی ہوئی طناب کے معمولی واقعہ سے عربوں کی کاروانی زندگی اور ان کے ذوقِ صحرا نوردی و جہاں بینی کی طرف لطیف اشارہ کرنا انہی کا کام تھا مصرع ثانی کی بلاغت و معنی خیزی Significance بھی آپ اپنی مثال ہے ع

کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں!

کا تجاہلِ عارفانہ و تغافلِ شاعرانہ ہمیں انسانی تاریخ کے اس وسیع پس منظر میں پہنچا دیتا ہے جہاں ہم تاریخ کی صبح طلوع ہوتے اور مختلف قوموں خصوصاً یہودیوں، عیسائیوں اور پھر مسلمانوں کے قافلوں اور کاروانوں کو اس مقام سے گذرتے اور سفر کرتے دیکھنے لگتے ہیں اور اس طرح عربوں کی عظمت رفتہ

کے ساتھ ہی اقوام گذشتہ کی پوری تاریخ نگاہوں کے سامنے دفعتہً آجاتی ہے شعر کی بلاغت اس وقت اور سامنے آتی ہے جب ہمارے سامنے یہ تاریخی حقیقت بھی ہو کر فلسطین اور بیت المقدس شروع سے قافلوں اور کاروانوں کا ملک رہا ہے اور اس کی حیثیت قوموں کی گذرگاہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ گویا بین الاقوامی، علاقہ کی رہی ہے اپنی غزل کو "آتشِ رفتہ کا سراغ" اپنی سرگذشت کو کھوئے ہوؤں کی جستجو اور اپنی موج نفس کو نشو ونمائے آرزو کہہ کر اقبال نے اپنی کلاسکیت، رومانویت، اپنی مشرقیت و اسلامیت اپنے نظریۂ فن کی روحانیت اور فلسفۂ خودی کی طرف بھی بلیغ انداز میں اشارہ کر دیا اقبال کا کارنامہ ملتِ اسلامیہ اور جمعیت انسانی کے دل میں نشو ونمائے آرزو، کے سوا اور کیا قرار دیا جا سکتا ہے؟

اپنی آتش نوائی کو خونِ دل وجگر کا نتیجہ کہہ کر اقبال نے ایک بار پھر اپنے نظریۂ فن اور صداقت اظہار کا اعلان اور اپنے کلام کو اپنے نظرئے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ پوری نظم پر ذوق وشوق، وجد وسرور، وصل وحضور، عشق کے سوز وساز اور محبت وعبدیت کے راز ونیاز کی فضا چھائی ہوئی ہے۔

اقبال اور مسئلۂ فلسطین[1]

اقبال کو ذاتی طور پر مسئلہ فلسطین اور عربوں کے مستقبل سے نہایت گہری دلچسپی تھی ان کے ذاتی خصوصاً مس فارقوہرسن کے نام کے خطوط میں مسئلہ فلسطین کے بارے میں ان کے دلی اضطراب کا پتہ چلتا ہے وہ مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے (مسلم لیگ کی بدولت) شاید فلسطین کے عربوں کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لئے جسکا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔ ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی چھاؤنی کا مسلط کیا جانا اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے پر خطر ہے"[2]

وہ مس فارقوہرسن کو لکھتے ہیں "فلسطین پر یہودیوں کا بھی کوئی حق نہیں۔ یہودیوں نے

---

[1] از قلم مترجم [2] اقبال نامہ ۲/۲۷

تو اس ملک کو رضامندانہ طور پر عربوں کے فلسطین پر قبضہ سے بہت پہلے اسے خیرباد کہدیا تھا صیہونیت بھی کوئی مذہبی تحریک نہیں۔ علاوہ اس امر کے کہ مذہبی یہودیوں کو صیہونیت سے کوئی دلچسپی نہیں خود فلسطین رپورٹ نے اس امر کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے[۵]"

ہندوستان میں جتنی فلسطین کانفرنسیں ہوئیں سب میں اقبال کے مشورے اور ہمدردیاں شامل تھیں، علامہ نے فلسطین رپورٹ کے خلاف مسلمانان لاہور کی کانفرنس کے موقع پر ایک بیان دیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

"عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے مجھے اس کا ایسا ہی شدید احساس ہے جیسا مشرق قریب کی صورت حال سے واقف کسی شخص کو ہو سکتا ہے .... یہ مسئلہ مسلمانانِ عالم کو ایک موقعہ بہم پہنچاتا ہے کہ وہ پوری قوت سے اس امر کا اعلان کر دیں کہ وہ مسئلہ جسکا حل برطانوی سیاستدان تلاش کر رہے ہیں محض قضیہ فلسطین ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہوگا ——— مسئلہ فلسطین کو اگر اسکے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فلسطین میں مسئلہ یہود کا تو ۱۳ صدیاں ہوئی حضرت عمرؓ کے یروشلم میں داخلہ سے قبل ختم ہو چکا تھا فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا بلکہ بقول پروفیسر ہوکنگ یہود اپنی مرضی اور ارادہ سے اس ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدون ہوا۔ مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا زمانہ حال کے تاریخی انکشافات نے پیٹر دی ہرمٹ کی ہستی ہی کو محل اشتباہ قرار دیدیا ہے[۶] الخ"

پہلی جنگ عظیم کا افسوسناک انجام یہ تھا کہ نزلہ عالم اسلام پر گرا، ادھر ترکی کی خلافتِ

۵۔ اقبال نامہ ۱/۴۴۶ ۶۔ ایضاً ۱/۴۵۲

اسلامیہ کا شیرازہ بکھر گیا، اور اتحادیوں نے سیاسی بندر بانٹ اور تقسیم کا پرانا حربہ آزادی سے استعمال کیا، چنانچہ ترکی کا مشرقی حصہ روس کے ہاتھ لگا، اور مغرب کے یورپی صوبے بلقان، ہنگری، بلغاریہ وغیرہ مکمل طور پر خود مختار ہو گئے۔ ایران اور شام فرانس کے ہاتھ لگا، اور مصر و عراق پر برطانیہ نے قبضہ جمایا۔ اس طرح سے عالم اسلام کے حصے بخرے ہو گئے۔ فلسطین کا مسئلہ ذرا بین الاقوامی نوعیت کا تھا اس لئے اسے "تہذیب و ترقی" کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے برطانیہ کے زیر انتداب رکھا گیا۔ اقبال اس صورت حال پر روشنی ڈالتے ہیں، اور یورپ کی اس سیاسی چال کو سامنے لاتے ہیں کہ وہ پہلے کمزور ممالک کو ظلم کا نشانہ بناتا ہے اور پھر اس کے غم میں مگرمچھ کے آنسو بھی بہاتا اور ہمدردی ظاہر کرتا ہے تاکہ عالمی سیاسیات میں ساکھ بھی قائم رہے اور اپنا مقصد بھی نکل آئے:

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

یورپ اس حکمتِ عملی کو تہذیب اور اصلاح، انتداب اور نگرانی کا نام دیتا ہے۔ لیکن یہ استحصال کے سوا اور کچھ نہیں:

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر — بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

جمعیت اقوام League of Nations نے اس زمانے میں بھی عربوں اور ایشیائیوں کے ساتھ موجودہ امتیازی سلوک جاری رکھا تھا۔ اور اس پر یہودی اور مغربی ممالک مسلط تھے۔ اقبال اسی لئے اسے کہیں "داشتۂ پیرکِ افرنگ" کہتے ہیں کہیں ان کفن چوروں سے تشبیہ دیتے

ہیں جو مشرق کو قبرستان بنا کر اسے بھی تقسیم کر لینے کے درپے رہتے ہیں۔ ع

بہر تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند!

اقبال مغربی سیاسیات پر یہودیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو سمجھ گئے تھے ان کا خیال ہے کہ ایک نہ ایک دن یورپ ان کے دامِ فریب کا شکار ہو کر رہے گا:

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار ‏ ‏ ‏ جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح ‏ ‏ ‏ دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

اپنی دوسری نظم یورپ اور یہود، میں یہی خیال ظاہر فرماتے ہیں:

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی!

۵ رجون کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہودی اور یہود نواز حلقوں کی ایک رائے یہ سننے میں آرہی ہے کہ یہودیوں کو عربوں نے ان کے وطن سے نکالا تھا اس لئے اگر انھوں نے اگر اپنا وطن دوبارہ زبردستی لے لیا ہے تو اس میں ان کا کیا قصور یہ سرزمین تو جیسا کہ صیہونی Zionists کہتے ہیں ارضِ موعودہ Promised Land ہے جہاں ہر یہودی کا آنا ضروری ہے۔

اقبال نے اپنے خطوط و بیانات میں اس کا جواب دیا تھا کہ یہودی فلسطین سے اپنی مرضی سے نکلے تھے اور یہ "خروج" عربوں کے فتح فلسطین سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ تاہم اقبال نے یہودیوں کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے ایک چبھتا ہوا سوال یہ اٹھا دیا کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین اور سسلی اور دوسری یورپین مفتوحہ علاقوں پر کیوں نہیں ہو سکتا ہے یہودیوں کا یہ دعوا ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین امریکہ پر اور ہن،

گاتھ، اور گال قومیں برطانیہ پر دعوا کردیں یا ہندوستان کے آریہ ایران اور روس پر دعوا کردیں کہ ان کا وطنِ اصلی واپس دیا جائے ——— اقبال کی نظر میں یہ تاریخ پر ظلم اس کے ساتھ مذاق اور اسے اپنی مرضی سے بدلنے کی مضحک کوشش ہے اگر انھیں وطن دینا ہی ہے تو جرمنی میں دینا چاہئے جہاں سے وہ نکالے گئے اپنے دعواسے ہزار سالہ دست برداری اور خاموشی کے بعد یہودیوں کا نیا دعوا بالکل بے دلیل ہے اور اس کے پیچھے مغرب کا ہاتھ ہے:

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا!

وہ فلسطینی عربوں کے مضمرات وامکانات اور ان کی صلاحیتوں سے واقف ہیں، اس لئے انھیں خودی کی پرورش، اور لذتِ نمود کی خلش کے لئے ابھارنا چاہتے ہیں اور وہ سوز وساز یاد دلاتے ہیں جس سے زمانہ اب بھی محروم نہیں ہے اقبال کے پیامِ خودی میں ظاہر ہے کہ عربی جذبات اور اسلامی احساسات ایمان ویقین کی کیفیات، روحانی امکانات، اور عزم وثبات ہی بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں وہ عربوں کو انہی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جنگِ حریت میں آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا اور خودی پر بھروسہ کے سوا یورپ یا اقوامِ متحدہ پر اعتماد خوش فہمی یا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

مسافر غزنی و افغانستان

اقبال نے ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے شہید و مجاہد بادشاہ نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کی سیاحت اور سلطان محمود غزنوی کی راجدھانی غزنی کی زیارت کی تھی۔ جہاں وہ حکیم سنائیؒ[1] کے مزار پر بھی حاضر ہوئے۔ اقبال سنائیؒ کو رومی کے بعد شعر و حکمت میں اپنا دوسرا استاد مانتے تھے۔ اس نادر اور زریں موقع نے ان کی طبیعت پر مہمیز کا کام کیا وہاں انھوں نے جو شعر کہے ہیں وہ ندرت و معنویت کے ساتھ ان کے ذوق و شوق، حسرتوں اور امیدوں کی سچی تصویر ہیں ان نظموں میں انھوں نے اپنے عہد پر ایک فلسفی شاعر اور انقلابی مسلمان کی طرح نظر کی ہے اور اپنی زیارت کو تاریخی حیثیت

---

[1] سنائی عہد غزنوی کے مشہور شعراء میں ہیں ان کی شاعری کا ارتقا غزل گوئی سے ہوا وہ دربار میں ملک الشعراء تھے لیکن توفیق الٰہی نے انھیں جب اپنا لیا تو دنیا اور شاہی درباروں سے قطع تعلق کر کے حقائق و معارف نظم کرنے لگے ۵۲۵ھ ان کا سنِ وفات ہے۔

دے دی ہے۔

نظم کے شروع میں اقبال نے "ہمرہانِ سست عناصر" کا گلہ اور دنیا کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا ہے جوان کے آفاقی جذبات اور نظریات کے لئے "تنگنائے" بن گئی ہے اور اس کے کوہ وبیاباں وادیٔ وکہسار، دشت وصحرا بھی ان کے "جنوں" کے لئے کافی نہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے جس بندے کو علوئے ہمت، بلند مشربی، اور سوزِ عشق دیا ہو اس کے لئے یہ کائنات یقیناً ناکافی ہوگی یہی وجہ ہے کہ مردانِ خدا، اور خود آگاہ اپنے کو اس عالم مادی سے آزاد کرلیتے ہیں اور اپنے لئے نئے آفاق فراہم کرلیتے ہیں، اسے وہ توحید کا راز کہتے ہیں جو اہل نظر پر خدابینی کا دروازہ کھول دیتا ہے اور دنیا میں ہوتے ہوئے دوسری دنیا کے مشاہدات وتجلیات سامنے کردیتا ہے۔

غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا
سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا

یہی توحید تھی جسکو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
خودی سے اس طلسم رنگ وبو کو توڑ سکتے ہیں

یہاں اقبال "طریقت وشریعت" کے پرانے معرکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علم و معرفت، اور دین ومحبت میں کوئی تضاد اور عناد نہیں یہ تو مدعیانِ شریعت وحقیقت کی غلط اندیشیاں ہیں اور یہ فقیہانہ پندار ہے جس نے معرفت ومحبت کو اپنا رقیب بنالیا ہے وہ یہاں ایک دوسرا نکتہ بھی بتاتے ہیں کہ شریعت وحقیقت کے پرستاروں کے لئے اصل چیز استغنار اور بے نیازی ہے جوان دونوں کی آبرو ہے، مادیت کے پرستاروں اور حکومت کے علمبرداروں سے کنارہ کشی کے بعد اہل دل استغنار ہی کے قلعے میں پناہ لے سکتے ہیں، اس موقع پر انھیں اہل حق کا مجاہدہ، ان کی سرفروشیاں اور سرگرمیاں یاد آجاتی ہیں تو روح الامین سے بھی چشمک کرلیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرشتے انسان کی عبدیت اور جوشِ محبت کی تقلید کہاں کرسکتے ہیں:

رقابت علم وعرفاں کی غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں | زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنار
نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی | تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

یہاں شاعر اپنے عہد کی طرف متوجہ ہوتا اور مشرق و مغرب دونوں پر تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے دونوں کو اپنی چشم جہاں بیں سے دیکھا اور پرکھا ہے اور دونوں کی خوبیوں اور خرابیوں، مشکلات و مسائل سے واقف ہوں پھر وہ اپنی حکیمانہ رائے اور تجربات کی روشنی میں کہتے ہیں کہ مشرق میں استعداد و صلاحیت بہت ہے لیکن اس کو قیادت اور صحیح رہنمائی نہیں مل رہی ہے اور مغرب کا حال یہ ہے کہ قوت کا نشہ اور سامان اور وسائل کی فراوانی کا خمار اس پر چھایا ہوا ہے اور اس افراط نے اس کی زندگی میں تلخی و بدمزگی پیدا کر دی ہے اس موقع پر انھیں مشرق کے وہ رجال یاد آجاتے ہیں جنھوں نے قیصر و کسریٰ کو چیلنج کیا اور فقر غیور سے بادشاہوں کو بھی لرزہ براندام کر دیا تھا اور ان کا وجود ہی باطل کی موت اور حق و صداقت کی فتح بن گیا تھا، شاعر عالم عربی کے حالات دیکھ کر اور زیادہ حزیں و غمگین ہوتا ہے اور عرب حکمرانوں اور سیاستدانوں کی بلاد عربیہ سے ناوفاداری اور خود فریبی، لذات و شہوات میں انہماک اور غفلت و عیش کوشی پر ایمان و حمیت کے جذبہ سے سرشار ہو جاتا ہے اور سخت گرفت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ شیوخ دامِ اگلیم بوذرؓ دلق اویسؓ اور چادر زہراؓ بھی بیچ سکتے اور وہ مقاماتِ مقدسہ بھی غیروں سے پامال کرا سکتے ہیں جو دین و ملت اور خود ان کی آبرو ہیں۔

شاعر عالم اسلامی میں اجنبی اثرات اور موجودہ حالات کو آشوب قیامت سمجھتا ہے اور سنائی کا وہ مصرع دہراتا ہے جو انھوں نے تاتاری حملوں کے وقت میں کہا تھا کہ چینی اور ترک تو فاتحانہ یا عقیدت مندانہ حرم تک آگئے لیکن مردِ حرم نیند کے مزے لے رہا ہے:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے | یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی | وہ بندے فقر تھا جنکا ہلاکِ قیصر و کسریٰ
یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے | گلیم بوذر و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے | گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

شاعر اس کے بعد مغربی تہذیب اور یورپ کی پیدا کردہ تمدن کا حکیمانہ تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حیات انسانی منفی اور مثبت قدروں کے اجتماع، باطل کے انکار اور حق پر اصرار کے بغیر مستحکم اور متوازن نہیں ہو سکتی یہی لاالٰہ الا اللہ کا رمز ہے۔ جس کا پہلا جز تمام معبودانِ باطل، اور مادی طواغیت کی کلی نفی اور دوسرا خدائے برحق کے یقینی اثبات پر مشتمل ہے مگر یورپ کی بدنصیبی ہے کہ اسکا پہلا دور تو بڑی تیزی سے ختم کر لیا اور عبد و معبود کا رشتہ کاٹ ڈالا اور قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی بیخ کنی شروع کر دی اور پوپ کی دینی سخت گیریوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ اقدام یقیناً مستحسن تھا لیکن وہ زندگی کے دوسرے اثباتی دور میں بالکل ناکام اور محروم رہا حالانکہ انسان، معاشرہ اور تہذیب صرف منفی اقدار کے سہارے نہیں چل سکتے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ یورپ جس نے علم و تنظیم اور قوت تسخیر سے دنیا کو زیر فرمان کر لیا تھا زندگی کے صحرا میں حیران و ہلکان نظر آنے لگا۔ نہ اس کے پاس ایمان تھا نہ پاک جذبات تھے نہ صالح مقاصد و غایات تھیں۔ اس لئے لازمی طور پر وہ زوال و فنا کے راستے پر چل پڑا، اس طرح اقبال نے ان لفظوں میں یورپ کی تاریخی و تمدنی تصویر بند کر دی ہے اور یہ نظم ان کی بصیرت و حکمت کا نمونہ بن گئی ہے۔

اقبالؒ یاس و تشائم سے بالکل الگ تھے اس لئے مشرق کے مستقبل سے وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے بلکہ عمر بھر اس کی نشاۃ ثانیہ کی آرزو ہی کرتے رہے وہ اس نظم میں بھی کہتے ہیں کہ مشرق قوت و صلاحیت کے ذخیروں سے بھرپور ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس بحرِ منجمد سے وہ تیز دھارا بھی اٹھے گا جو فساد و استبداد کے سفینے ڈبو دے گا لیکن اس کے باوجود وہ مغربی استعمار

کے عزائم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جس نے اسلامی مشرق کو اپنی سازشوں Conspiracies کا شکار اور اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے جس نے اس کے افکار و خیالات تک کو غلام بنا لیا ہے چنانچہ مشرق خوب و ناخوب کے ذوق و تمیز سے بھی محروم ہو گیا ہے اور اس کی رائے بے وزن ہو گئی ہے اس لئے کہ غلامی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی اور کور ذوق بنا دیتی ہے۔ دنیا میں مردانِ احرار و غیور ہی کی رائے، ان کے خیالات و افکار پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ فراست و بصیرت انہی کا حصہ ہوتی ہیں اور صاحب زمان اور ابوالوقت وہی ہوتا ہے جو مستقبل کی جھلک اور گوہر فردا کی چمک پہلے ہی دیکھ لیتا ہے۔ اقبال کو انہی کی زبان میں سنئے:

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے　　مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا
دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے　　بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا
اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی　　نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا
غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی　　جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر　　کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے　　زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

پھر مشرقی دماغوں پر مغربی ثقافت کے سحر و اثر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغرب کے شیشہ گر اور چابکدست صناع نے غیور و جسور سخت کوش اور خوددار قوموں کو بھی نزاکت و نفاست کا سبق پڑھا کر موم کر لیا ہے، اس کیمیا گر ساحر نے پہاڑوں اور چٹانوں کو بھی اپنی حکمت عملی سے پانی کی طرح سیال اور مٹی کی طرح پامال بنا دیا ہے۔ لیکن میں اس اکسیر کا مالک ہوں جو شیشہ کو پتھر کی وہ صلابت دیتا ہے کہ اسے سیل تند و تیز بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا اور نہ اسے پھاوڑوں سے ٹھیس لگ سکتی ہے میں نے ایمان و استغناء کے ید بیضا سے بڑے بڑے جابر فرعونوں کا غرور

توڑا اور مقابلہ کیا ہے میرا شرارہ جو باطل کے خس و خاشاک کو بھسم کرنے کے لئے ہے وہ کوڑے کرکٹ سے کیوں کر دب سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محبت انسان میں عزت نفس، غیرت و حمیت اور دنیا اور دنیا داروں سے نفرت سکھاتی ہے ——— یہاں پہنچ کر ان کی طبیعت کھل اٹھتی ہے اور پیغام رسالت کی ابدیت اور آپؐ کی معجزانہ شخصیت کا عشق انھیں مسحور و مخمور بنا دیتا ہے یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں اقبال اپنے قابو میں نہیں رہتے اور زمام اختیار ان کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے وہ عالم سرور و حضور میں کہتے ہیں کہ کوئی تعجب نہیں اگر ستارے میری گرد راہ اور افلاک و کواکب میرے پا انداز ہو جائیں اس لئے کہ میں نے اپنا رشتۂ جاں رکاب رسالتمآبؐ سے باندھا ہے جن کا ستارہ کبھی غروب اور جن کا اقبال کبھی مائل بزوال نہیں ہوتا جو علم و عرفاں، رسالت و نبوت کا مطلع، اور سیادت و قیادت کا مرجع ہیں جن کے قدموں سے چھو کر غبار راہ میں وادیٔ ایمن کا نور اور مشتِ خاک میں عالم پاک کا ظہور دعوت نگاہ دیتا ہے مسافر شاعر یہاں اپنی منزل پر پہنچ کر اپنا سفر ختم کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ سنائی کا ادب کچھ اور کہنے سے مانع ہے۔

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی ۔۔۔ مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا
رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک ۔۔۔ مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا
وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے ۔۔۔ جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا
محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری ۔۔۔ محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا
عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں ۔۔۔ کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے ۔۔۔ غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا!
نگاہ شوق و مستی میں وہی اول وہی آخر ۔۔۔ وہی قرآں وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ
سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ ۔۔۔ ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا!

(بال جبریل)

مسافر کی واردات و مشاہدات[1]

اقبال نے اکتوبر ۱۹۳۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کا یہ سفر کیا تھا اور واپسی پر اپنی مثنوی "مسافر" لکھی تھی جو دراصل ملتِ افغان کے نام ایک دعوتی پیغام کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ہم اقبال کے ساتھ اس وادی عزم و شوق میں بھی کچھ دور سیر سفر کرنا چاہتے ہیں وہ جب درہ خیبر سے گزرتے ہیں تو یہاں سے گزرنے والے مردانِ حق اور تاریخ کے صد ہزار افسانے یاد آجاتے ہیں وہ بے سبزہ کے کہساروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ان کے سینوں سے رنگ و بو کی نزاکت نہیں اگتی۔ جہاں کا مور بھی شاہی مزاج اور آہو شیراں شکار ہوتا ہے۔ لیکن لامرکزیت نے ان بہادروں کو آشفتہ روزگار اور بے نظام و ناتمام و نیم سوز بنادیا ہے اور ان کے پتھروں سے خود ان کے مینائے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہے۔

وہ اقوام سرحد کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی عظمت رفتہ اور اپنی خودی کی بازیافت کرو اسلام میں یہ تجاہل و تغافل حرام ہے خود آگاہی دین اور زندگی کا پیام اور خود فراموشی موت کا نام ہے۔

وہ بڑے درد و سوز کے ساتھ افغانوں سے کہتے ہیں:

میر خیل! از مکر پنہائی بترس،

از ضیاعِ روحِ افغانی بترس!

وہ افغانوں کو بار بار وحدت و مرکزیت کا سبق یاد دلاتے ہیں کہ یہی حیات اور برگ و ساز کائنات ہے وہ افغانوں کی پستی اور پسماندگی کا سبب ان کی حال پر قناعت اور مستقبل سے غفلت کو قرار دیتے ہیں۔

---

[1] اضافہ از مترجم

وہ کہتے ہیں کہ قوموں کی ترقی کے لئے امید و آرزو اور ایک متفقہ نصب العین ضروری ہے ———

اقبال نے اس کے بعد نادر شہید سے ملاقات کی اور انھیں ایک دردمند مسلمان پایا اسلام اور ملت اسلامیہ کے غم میں دونوں دیر تک روتے رہے آخر میں شہنشاہ نے اپنی طاقت کو قرآن کی برکت کہا اور اپنے عزائم و افکار کا اظہار کیا اور اقبال نے ان کی اقتدا میں نماز عصر پڑھی اقبال کہتے ہیں کہ اس نماز شوق کی کیفیت ناقابل بیان تھی:

راز ہائے آں قیام و آں سجود
جز بہ بزم محرماں نتواں کشود

"مسافر" کابل اور شہنشاہ بابر کے مزار کی زیارت کرتا ہوا غزنی میں حکیم سنائی کے مزار پر حاضر ہوتا ہے اور ملت کی زبوں حالی کا علاج پوچھتا ہے جس پر روح سنائی جواب میں کہتی ہے کہ قوموں کا وجود "فقر و عشق" سے دوام اور استحکام حاصل کرتا ہے اور "دل و دین" ہی ہر قوت کا سرچشمہ ہیں اور یہ دین بزرگوں کی نظر اور اہل دل کی صحبت کے فیض و اثر سے پیدا ہوتا ہے بوعلی سینا عالمِ آب و گل ہے لیکن خستگیہائے دل سے بے خبر وہ جسم و تن کا بڑا معالج ہے لیکن قلب و روح کا درماں اس کے پاس نہیں:

دل ز دیں سرچشمۂ ہر قوت است ——— دیں ہمہ از معجزات صحبت است
دیں مجو اندر کتب اے بے خبر ——— علم و حکمت از کتب، دیں از نظر
بوعلی دانندۂ آب و گل است ——— بیخبر از خستگیہائے دل است
نیش و نوشِ بوعلی سینا بہل ——— چارہ سازیہائے دل از اہل دل

"مسافر" غزنی میں سلطان محمود کے مزار پر عقیدت مندانہ حاضر ہوتا ہے اور قندھار میں خرقۂ مبارک کی زیارت کرتا ہے اور پھر موکسس ملتِ افغانیہ احمد شاہ بابا کی طرف سے اعلیٰحضرت ظاہر شاہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جہان شب و روز میں جو صاحب امروز ہے مستقبل بھی اسی کا ہے اور جو بیداری سخت

کوشی اور کرّاری سے رہتا ہے وہی زندہ رہ سکتا ہے، یہ کرّاری، حیدر کرّارؓ کے مقامات میں سے ہے یہ عثمانیوں اور ہندی مسلمانوں میں جب تک باقی رہی ان کا جاہ وجلال بھی رہا اور وہ نہ رہی تو ان کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا کتاب وسنت ہی اعتبار ملت اور قوت کا ذخیرہ ہیں، قرآن جہانِ ذوق وشوق کی برکات اور سنت" عالم تحت وفوق کی فتوحات کا ضامن ہے، قرآن اگر مومن کا جمال ہے سنت بھی اس کا جلال۔ قرآن ہی ثبات وحیات کی بنیاد ہے اور کچھ نہیں:

برخود از قرآن اگر خواہی ثبات
درضمیرش دیدہ ام آب حیات!

طارق کی دُعا

(اندلس کے میدان جنگ میں)

تازہ دم اور جوان العمر طارق بن زیاد جب عربی فوجوں کے ساتھ اندلس میں اترا تو اپنی فوج کے ان سفینوں کو جلا ڈالنے کا حکم دیدیا جن کے ذریعے اس کے لشکر نے دریا عبور کیا تھا اور یہ اسلئے کیا تھا کہ مسلم فوجوں کو پھر بھاگنے اور واپس ہونے کا خیال بھی نہ رہے جلانے کے بعد اس نے اپنے یادگار تاریخی خطبے میں کہا "ایھا الناس این المفر، البحر من ورائکم، والعدو امامکم ولیس لکم واللہ الا الصدق والصبر" لوگو! راہِ فرار کوئی نہیں۔ سمندر تمہارے پیچھے اور دشمن تمہارے سامنے ہے۔ اب خدا کی قسم صبر و ثبات، اور سچے مجاہدانہ ذوق و شوق کے سوا تمہارا کوئی ساتھی نہیں ——— اس شعلہ نوائی نے فوج کو دل وجان سے تیار کر دیا اور اللہ تعالےٰ کے بعد اپنے بازوؤں اور تلواروں پر انکا بھروسہ پختہ ہوگیا۔

طارق نے دشمن کے مقابلے پر صف بندی کے بعد اپنی فوج کا معائنہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ

اسپینی فوج سے عددی طاقت اور فوجی قوت میں وہ بدرجہا کمتر ہے اور کسی رسد اور کمک کی بھی امید نہیں دشمن اپنے ملک میں ہے وہ ہر وقت اپنی طاقت بڑھا سکتا ہے لیکن اسلامی فوج غریب الدیار اور اپنے مرکز سے سیکڑوں میل دور ہے اس لئے کسی بیرونی مدد کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اگر چھینے ہوئے ہتھیار کچھ کام دے سکیں تو خیر ورنہ کسی کی خیر نہیں اس روح فرسا صورتِ حال نے طارق کے دل میں قدرتی طور پر تشویش، اندیشے، اور اضطرابی کیفیت پیدا کی اور اسے کوئی تدبیر Tactics سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مگر بالآخر اسے ایک ہی حیلہ سمجھ میں آیا کہ فوج کی روحانی طاقت اور ایمانی صلاحیت کو بڑھا کر وہ الٰہی مدد حاصل کی جائے جو ناقابل تسخیر اور غیر مغلوب ہے تائیدِ غیبی پر طارق نے بھروسہ کیا اور یقین کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ ہے کیونکہ اسے اپنے موقف کی صداقت و حقانیت پر پورا اطمینان تھا کہ یہ فوج حزب اللہ، اور جنود الرحمٰن ہے یہ ملک گیری، جوع الارض کی تسکین اور اپنا اقتدار منوانے کے لئے نہیں نکلی ہے بلکہ صرف "اعلائے کلمۃ اللہ اور حق و صداقت کے بول بالا کے لئے آئی ہے وہ اس لئے سر ہتھیلی پر لیکر نکلے ہیں کہ لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف، انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگنائے سے وسعتِ آفاق کی جانب اور مذاہب کے ظلم و ستم سے بچا کر اسلام کے عدل و اعتدال کی سمت رہنمائی کرے اللہ تعالےٰ نے اس مقصد سے معرکہ آرا ہونے والوں کی فتح و ظفر کا وعدہ کیا ہے" وَاِنَّ جندَنا لھم الغالبون"

اس موقع پر مسلمان کمانڈر نے اپنے رب سے دعا کی اور وہ اس کی مدد کا طالب ہوا مسلمان قائد اس وقت رسولِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر رہا تھا جنھوں نے پہلی اسلامی فوج کی قیادت کی تھی اور بدر کے میدان میں صف آرائی کے بعد خلوت عریش میں جا کر اور سجدے میں گر کر اپنے خدا سے رو رو کر عرض کیا: "اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لن تعبد" (اے خدا اگر یہ جماعت آج ہلاک ہو گئی تو پھر دنیا میں تیری عبادت نہ ہو سکے گی۔)

چنانچہ طارق نے اپنے پیغمبرؐ اور اپنے سردارؓ کی تقلید کرتے ہوئے ایسی دعا مانگی جسے عام طور پر قائد اور فاتح نہیں مانگا کرتے اور نہ کسی کو اس کا خیال ہی آتا ہے اقبال نے اس عروسِ جمیل کو لباس حریر پہنا کر اور دلآویز بنا دیا ہے طارق نے اپنی دعا میں کہا کہ - اے خدا! یہ بندے جو تیرے راستے میں جہاد کے لئے نکلے ہیں اور تیری رضا ڈھونڈتے ہیں یہ پر اسرار بھی ہیں اور صاحب اسرار بھی ہیں ان کی حقیقت اور ان کا مقام تیرے سوا کوئی نہیں جانتا، تو نے انھیں عالی ہمتی اور بلند پروازی سکھائی ہے اس لئے وہ عالمی سیادت اور عالمگیر حکومت الٰہیہ سے کم پر راضی نہیں ہوں گے یہ طبل غیور وہ ہیں جو تیرے سوا کسی سے نہیں دبتے اور کسی کی نہیں سنتے ۔ صحرا و دریا ان کی ٹھوکروں کے اشارے پر چلتے ہیں اور ان کی ہیبت اور رعب و دبدبہ سے پہاڑ بھی گرد ہو جاتے ہیں ۔ تو نے انھیں اپنی محبت کا آشنا بنا کر دو عالم سے بیگانہ بنا دیا ذوق شہادت اور شوق جہاد کے سوا دنیا اور دنیا کی حکومت بھی ان کے لئے کوئی چیز نہیں ۔ اور محبت دل میں گھر کرنے کے بعد یہی کچھ کرتی ہے ۔ یہی ایک دھن ہے جو انھیں اس دور دراز ملک تک لے آئی ہے یہ لگن مومن کی آخری خواہش اور سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے،

دنیا ہلاکت کے دہانے اور تباہی کے غار پر کھڑی ہے انھیں اس میں گرنے سے عرب اپنی جان دے کر اور خون بہا کر ہی بچا سکتے ہیں دنیا عربی خون کے لئے پیاسی ہے اس کی تشنگی اور بیماری اسی مقدس خون سے دور ہو سکتی ہے ۔ خیابان و بیاباں میں لالۂ و گل اسی سرخ خون کے منتظر ہیں کہ اسے اپنا غازۂ رخسار بنائیں ہم اس سرزمین میں اسی لئے آئے ہیں کہ اپنے جسم و تن کا بیج بوئیں اور خونِ دل سے اس کی آبیاری کریں تاکہ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتی لہلہانے لگے اور خزاں کے طویل عہد کے بعد بہاریں لوٹ آئیں ۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے   جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی!

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

اے خدا! تو نے صحرانشینوں اور اونٹوں کے چرواہوں پر اپنے وہ مخصوص انعام کئے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں تو نے انھیں، نیا علم، نیا ایمان اور نیا طرز زندگی بخشا، تو نے انھیں اذانِ سحر کی دولت دی جو علم صحیح، ایمان قوی، اور ذوق سلیم سے عاری دنیا میں توحید کی کھلی دعوت ہے جو لوگوں کو غفلت و جہالت کی نیند سے بیدار کرتی ہے عربوں نے اس کے سہارے دنیا پر چھائے ہوئے موت کے سناٹے کو توڑا اور اندھیریوں میں ڈوبی ہوئی دنیا کو صبح نو کی بشارت دی۔ زندگی نے حرکت وحرارت کھودی تھی اور اس کی محرومی پر صدیاں گزر چکی تھیں بالآخر اس نے عربوں کے سوز دروں اور جگر لخت لخت سے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا اور ایمان و محبت کو حاصل کیا یہ مجاہد موت کو زندگی کی انتہا اور جان کا زیاں نہیں سمجھتے بلکہ اسے نئی زندگی کا فتح باب اور عیش تازہ کا سامان جانتے ہیں یارب! امت مومنہ کو پھر ایمانی حمیت اور بغض فی اللہ دے جس کا ظہور دعائے نوح میں ہوا تھا کہ انھوں نے دل برشتہ ہو کر کہا تھا رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ تاکہ یہ فوج عالم کفر و فساد کے لئے برق صاعقہ فگن بن جائے انھیں عزم و یقین دے اور لوگوں میں ان کا وہ رعب قائم فرما کہ ان کی نگاہ، سپاہ اور ان کی للکار، تلوار بن جائے:

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا!
خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کردے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں!
عزائم کو سینوں میں بیدار کردے — نگاہِ مسلماں کو تلوار کردے
(بالِ جبریل)

اس مومن و مخلص قائد کی دعا قبول ہوئی اور اسلامی فوج اپنے اس دشمن کے مقابلے میں کامیاب ہوئی جو طاقت اور عددی اکثریت میں اس سے کئی گنا بڑا تھا اور عیسائی اندلس، اسلامی اور عربی اندلس بن گیا اور مسلمانوں کی وہ پائدار حکومت قائم ہوئی جو صدیوں تک رہی اور پھر اس کا خاتمہ اسی وقت ہوا جب طارق اور اس کے ساتھیوں کی روح ان میں باقی نہیں رہی اور وہ نصب العین یاد نہیں رہا جو انھیں یہاں تک لایا تھا، جذبۂ ایمانی کا فقدان، طاؤس و رباب کے مشاغل اور خانہ جنگیوں نے حکومت کے ساتھ ہی مسلمانوں کا وجود یہاں تک خطرے میں ڈال دیا کہ ایک متنفس بھی باقی نہ رہا۔ غافلوں اور خود فراموشوں کے ساتھ خدا کا ہمیشہ یہی معاملہ رہا ہے۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

ساقی نامہ

"ساقی نامہ" اقبال کی منتخب نظموں میں شمار ہوتا ہے۔ خیالات و افکار کی پختگی اور قطعیت تو اس میں نمایاں ہی ہے، ادبی اور فنی لحاظ سے بھی اردو میں ایک منفرد شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے یہ شاید اردو میں پہلا "ساقی نامہ" ہے جس میں اس روایت کی بنیاد ڈالی گئی ہے، اردو کے علاوہ خود فارسی میں بھی ظہوری وغیرہ کا ساقی نامہ، اپنی بہت محدود دنیا رکھتا ہے لیکن اقبال کی عبقریت فکر کا کمال یہی ہے کہ وہ جس صنفِ سخن کو ہاتھ لگاتے ہیں اسے بلند تر کر دیتے اور لفظ و معنی کی دنیا میں اپنے جہانِ نو کی بنیاد رکھ دیتے ہیں فارسی اور اردو میں میر حسن اور نسیم کی یا دوسری مثنویاں صرف بیانیہ حیثیت رکھتی ہیں اور واقعہ نگاری کے لئے مفید ہیں لیکن تفکر اور نازک خیالی کے لئے انھیں بیچ بیچ میں غزلیں لکھنا پڑتی ہیں اس کے برخلاف اقبال نے مثنوی میں قصیدہ اور غزل دونوں کی روح بھی برقرار رکھی ہے اور مثنوی کو سیدھی اور سپاٹ ہونے سے بچا لیا ہے۔ الفاظ کی روانی، خیالات

کی جولانی اور سیلانِ شعور Stream of Consciousness کی جو کیفیت ہے وہ اقبال ہی کا حصہ ہے[1]۔

اقبال تمہید میں حدیث بہار کہتے ہیں کہ موسم گل آگیا، دشت وجبل میں اس کے نقیب پھیل گئے، لالۂ وگل، نسرین ور یاحین کی حکومت نے اپنا نقشہ جما لیا۔ پتھروں اور جمادات میں بھی بہار نے زندگی پیدا کر دی، دنیا کو فرح وسرور کی بدلیوں نے گھیر لیا۔ اس نشاط افزا ماحول میں چڑیاں گھونسلوں سے باہر آگئیں چشمے اور ندیاں سینۂ کوہ سے نکل کر میدانوں میں زندگی کی طرح جھومتی آگے بڑھنے لگیں کبھی دھیرے اور کبھی تیز، رکتی اور اچھلتی، چٹانوں کو توڑتی اور کہساروں سے ٹکراتی اور زندگی کے نغمے سناتی ہوئیں رواں دواں ہیں۔ اقبال اس نغمے پر کان لگاتے ہیں تو اس سے زندگی کا پیام سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بہتے ہوئے دریا گھومتے اور مڑتے ہوئے اپنے مقاماتِ سفر بدلتے رہتے ہیں لیکن زندگی اور حرکت سے خالی نہیں رہتے۔ ان کا فیضان جاری اور سیلان باقی رہتا ہے۔

زندگی کا بھی کچھ یہی انداز ہے وہ زبان ومکان کی ہر رہ گزر سے گزرتی ہے لیکن کہیں سکون پذیر نہیں ہوتی۔ بہار کے ان دلکشا مناظر میں اقبال عبرت وبصیرت پا لیتے ہیں اور اسے وہ اپنی امیدوں کے مرکز یعنی ملت اسلامیہ کی نئی نسل کو دیتے ہیں:

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار — ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل ونرگس وسوسن ونسترن — شہیدِ ازل، لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

---

[1] اضافہ از مترجم

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی | اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی | بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ | پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام! | سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز | کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات | وہ مئے جس سے ہے مستیٔ کائنات
وہ مئے جس میں ہے سوز و سازِ ازل | وہ مئے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے | لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اقبال کہتے ہیں زمانہ کا طرز و انداز بدل گیا، یورپ کے اسرار فاش ہونے لگے اور مشرق کے خلاف اس کی سازشوں کا راز کھل گیا اور اس نے یورپی شاطروں کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ مغربی سیاست کا افلاس اور اس کی کہنہ روایات کا دیوالیہ پن ایسا رسوا ہوا کہ لوگ امارت و ملوکیت کے نام سے چڑھنے لگے اور امیروں اور بادشاہوں کو چیلنج کرنے لگے سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی کا زمانہ لدگیا اور وہ ڈرامہ ختم ہوا جسے ہوس پسند بادشاہوں نے صدیوں کھیلا تھا اور نیند کے ماتے گراں خواب عوام بھی بیداری کی کروٹیں بدلنے لگے۔ ہمالہ سے زندگی کے سوتے پھر سے ابلنے لگے اور فاران کی تجلی، اور سینا کی روشنی پھر ظہور کے لئے بے تاب ہونے لگی ——

وہ حسب عادت یہاں سے روئے سخن اپنی محبوب ملت اسلامیہ کی طرف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان اگرچہ توحید سے سرشار ہے لیکن بدعت و وثنیت کے جراثیم سے وہ پوری طرح پاک نہیں اس کے علم و ثقافت، اور کلام و تصوف عجمی اثرات سے محفوظ نہیں ہیں حقیقت پر وہم و خرافات کا ستم اب بھی جاری اور امت پر فسون و افسانہ کا طلسم اب بھی طاری ہے۔ خطیب و واعظ حسن کلام

کا جادو جگاتے ہیں لیکن ذوق وشوق کے لطف ولذت سے وہ ناآشنا ہیں ان کی باتیں منطق وہ فلسفہ کے آداب کے مطابق اور فصاحت کے اصول کے موافق ہیں لیکن وہ قلب وروح کی گہرائیوں میں نہیں اترتیں:

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

وہ صوفی جو خدمتِ خلق، تلاشِ حق اور غیرتِ دینی کے لئے مشہور تھا اسے عجمی فلسفے نے اپنا صیدِ زبوں بنا لیا اور احوال ومقامات میں کھو گیا، مجموعی طور سے عالم اسلام زوال کے اسقدر قریب آگیا کہ مسلمانوں کا سوزِ عشق بجھ چلا، شعلۂ حیات راکھ بن گیا۔ اور مسلمان کا وجود وعدم برابر ہو گیا:

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر وسلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا، — تماشا دکھا کر مداری گیا،
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے،
دلِ طور وسینا وفاراں دو نیم — تجلی کا پھر منتظر ہے کلیمؑ!
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
بھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد　　محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا،　　یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبال مخلصانہ دعا کرتے ہیں کہ خدا پھر اس امت میں روحِ زندگی بیدار کرے اسکی عظمت رفتہ اسے واپس دلادے اور اس کے وجود میں سوزِ دروں اور شعلۂ محبت کو ایک بار پھر بھڑکا دے کہ وہ اس سے اپنی نشاۃ ثانیہ کا سامان کرے، اور محبت کے پروں سے پرواز کرکے وہاں پہنچے جہاں گرانبار مادہ پرست نہیں پہنچ سکتے۔ وہ آرزو کرتے ہیں کہ اس پسماندہ امت کو ایک بار پھر قلب علی مرتضیٰؓ کی دھڑکن اور صدیق اکبرؓ کی دھن اور لگن عطا ہو اور اسے دوبارہ وہ "سوزِ مشتاقی" مرحمت ہو جو زندہ قوموں کو ملا کرتا ہے یہاں شاعر، ونازاور عشق وایمان کے احساس سے سرشار ہو اٹھتا ہے کہ اور کہتا ہے کہ" اے خدا! تیرے آسمان و زمین ازلی اور تیرا جلال وجبروت ابدی ہیں۔ مسلم جوانوں کو بھی تو اس کا رازداں بنا اور ان کے دلوں میں زندگی کا سوز و ساز اور درد وگداز پیدا کردے اور میری جیسی محبت و دلسوزی اور حکمت و بصیرت انھیں بھی عطا کر، میرے سفینے کو گرداب سے نکال اور منزل پر پہنچا۔ اور موت و حیات کے اسرار پنہاں سے مجھے بھی آگاہ کر اس لئے کہ تجھ سے بڑھ کر علیم و خبیر کوئی نہیں۔

اے میرے مالک و آقا! میرے پاس یہی چند آلام و افکار ہیں جنھوں نے مجھے دیدۂ بے خواب اور ماہیٔ بے آب بنا رکھا ہے میرا سرمایہ یہی خام امیدیں اور ناکام تمنائیں جن کے سہارے میں جی رہا ہوں۔ میری کائنات میری آہیں ہیں جن سے رات کا سناٹا توڑتا ہوں میری کل پونجی وہ چند ساعتیں ہیں جب میں تیرے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرتا اور عرض پرداز ہوتا ہوں یا وہ چند لمحات ہیں جب میں انجمن آرزو میں اپنا ذوق و شوق بکھیرتا اور اپنے اشک گوہر شک

بہاتا ہوں۔

اے میرے مولیٰ! تو نے میری فطرت کو ایسا آئینہ بنایا جس میں روح عصر کا ہر رُخ جھلک اٹھتا ہے اور جس میں الہام غیبی کی تصویر کھچ جاتی ہے۔ اے میرے ملجا و ماویٰ! میرا دل ہی رزم گاہِ حیات ہے جہاں خیر و شر کے معرکے برپا ہوتے رہتے ہیں اور ظن وتخمیں، اور ایمان یقین کی پیکار جاری رہتی ہے۔ میرے رب! یہی کل میری کائنات ہے میں التجا کرتا ہوں کہ اس سرمایۂ حقیر اور متاعِ فقیر کو نوجوانانِ اسلام میں لٹا دے اس لئے کہ وہی اس کے اہل اور مستحق ہیں:

شراب کہن پھر پلا ساقیا | وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پَر لگا کے اڑا | مری خاک جگنو بنا کر اڑا!
خرد کو غلامی سے آزاد کر | جوانوں کو پیروں کا استاد کر
مری شاخ ملت ترے نم سے ہے | نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے، پھڑکنے کی توفیق دے | دلِ مرتضےٰ رضہ سوزِ صدیق رضہ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر! | تمنا کو سینوں میں بیدار کر!
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر | زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے | میرا عشق، میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر | یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجکو اسرارِ مرگ و حیات | کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں | مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز | مری خلوت انجمن کا گداز!
امنگیں مری، آرزوئیں مری، | امیدیں مری جستجوئیں مری

مری فطرت، آئینہ روزگار — غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

اس کے بعد انھوں نے فلسفۂ حیات، کثرت میں وحدت اور زندگی کے مختلف مظاہر میں ظہور اس کے تغیر و تبدل، اس کی قوت و سرعت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے یہ حصہ ادب و فلسفہ کا شاہکار سمجھا جا سکتا ہے خصوصاً یہ اشعار اپنی معنویت کا جواب نہیں رکھتے:

دمادم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود!
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

آخر میں اس مسلم نوجوان کو نصیحت کرتے ہیں جو مادی ترغیبات کا اسیر ہوتا جا رہا ہے کہ جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو اور شریف آدمی اپنی عزت اور حیثیتِ عرفی کھو دیتا ہو وہ اس کے لئے سم قاتل ہے روزی وہی ہے جس میں آبرو محفوظ ہو اور آدمی سر اٹھا کر چلے وہ اسے اپنی شخصیت و خودداری کی قیمت سمجھاتے ہیں اور اس سجدۂ شوق کے اسرار فاش کرتے ہیں جو ہر سجدے سے بے نیاز کر دیتا ہے پھر اسے وہ نئی فتوحات اور ترقیات نئی پیشقدمیوں اور نئی مہمات کے لئے آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی جرأت و عزیمت سے ان نئی دنیاؤں کا انکشاف بھی کرے جو علمائے طبیعات و سائنس کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہیں آتیں۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیائے رنگ و بو جس پر موت کی حکمرانی ہے جو جنت نگاہ اور فردوس گوش ہے جس میں بہت سے آدمی صرف اکل و شرب کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ خود آگاہوں کی نگاہ میں منظر اولیں کی حیثیت رکھتی ہے منزل آخریں کی نہیں یہ ہمارا آشیانہ اور آخری نشانہ نہیں اور روح بیتاب کا مولد و منشا یہ خاک پامال نہیں، انسان سرچشمۂ کائنات ہو سکتا ہے لیکن یہ کائنات اس کی اصل نہیں ہو سکتی وہ مومن کو جرأت و جسارت کا پیام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم لمحہ لمحہ آگے بڑھتے اور سامانِ سفر تازہ کرتے رہو اور مادیت کے کہسار کو ٹھوکروں سے توڑتے رہو جو جادۂ زندگی کے ہر موڑ پر حائل ہوتا ہے زمان و مکان سے تم بغاوت اور ان کی اطاعت سے نفرت کرو اور ان کے حدود و قیود سے اپنے کو آزاد کر لو، ان کی سرحدوں سے آگے بڑھ جاؤ۔ اس لئے کہ مومن جب خود کو پہچانتا ہے تو وہ اس دنیا کو اسیر کر لیتا اور ارض و سما، کو اپنا نخچیر بنا لیتا ہے ——— وہ کہتے ہیں کہ یہاں ایک دنیا نہیں ہزاروں جہانِ نادیدہ ہیں اسلئے کہ دل کائنات کی جھولی ابھی خالی نہیں ہوئی اور اس کی تازہ کاری ابھی ختم پر نہیں آئی یہ دنیا تمہارے اقدام کی منتظر اور مشتاق ہے وہ تمہارے فکر و عمل کے حدود کے اعتبار سے اپنے وجود میں بھی پھیلاؤ پیدا کرتی ہے۔ گردشِ دوراں کا مقصد ہی یہی ہے کہ تم پر تمہارے مضمرات و امکانات کو روشن کر دے اور تمہاری حقیقت تمہارے سامنے لائے۔ تم فاتح کائنات اور بے نیازِ تعریف و صفات ہو، فرشتے بھی تمہارے احوال و مقامات کی تمنا کرتے ہیں لیکن تم وہ طائر بلند بام ہو جہاں تک ان کی پرواز نہیں:

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیدارئ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

ازل اسکے پیچھے ابد سامنے نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب وہ ناں جس سے جاتی رہے اسکی آب
وہی ناں ہے اسکے لئے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
تری آگ اس خاکداں سے نہیں جہاں تجھسے ہے تو جہاں سے نہیں
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود!

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار[۱]

تا بساطِ دین آبا در نورد، با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد!
پاش پاش از ضربتش لات ومنات انتقام از وے بگیر اے کائنات
دل بغائب بست واز حاضر گست نقشِ حاضر را فسونِ او شکست
دیدہ بر غائب فروبستن خطاست آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست
پیش غائب سجدہ بردن کوری ست دینِ نو کور است و کوری دوری است
خم شدن پیش خدائے بے جہات بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلات

ابوجہل کہتا ہے "محمد کا دین وطینت، قومیت کے لئے موت ہے اور وہ خود قریشی ہو کر غلاموں کی عزت کرتے ہیں اور امیر کو فقیر پر عربی کو عجمی پر ترجیح نہیں دیتے اپنے غلام کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں افسوس انھوں نے احرار عرب کی قدر افزائی نہیں کی اور عجمی گنواروں اور کالے غلاموں کو انکا ہمسر بنا دیا اور سفید فام آقاؤں کو کالے بھجنگے غلاموں سے کریم کو لئیم سے، اور برتر کو کمتر سے ملا دیا اور عربوں کی ناک کٹوا دی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ اسلامی اخوت محمد نے عجمی تخیل سے لی

---

[۱] بال جبریل۔

ہے وہ سلمان فارسی، اوران جیسے عجموں کے فریب خوردہ ہیں اور انھوں نے اپنی ذہنی اپج سے عربوں کے لئے مصیبت کھڑی کر دی اس ہاشمی جوان نے اپنی قیمت اور حیثیت کو خود ختم کیا اور اسے اس کی نمازوں نے سادہ لوح بنا دیا کیا کسی عجمی کا شجرۂ نسب ہمارے جیسا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ نطق اعرابی، اور لہجہ مصری میں بات کر سکتا ہے؟ عرب دانشورو! اٹھو اور محمد کے وحی والہام اپنے پروپگنڈے سے ختم کر دو اور عربیت کو زندہ کر دکھاؤ:

مذہب او قاطع ملک ونسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلام خویش بر یک خواں نشست

قدر احرارِ عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در ساختہ

احمراں با اسود آں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی ست — خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

ابن عبداللہ فریبش خوردہ است — رستخیزے بر عرب آوردہ است

عزتِ ہاشم زخود مہجور گشت — از دو رکعت چشم شاں بے نور گشت

اعجمی را اصل عدنانی کجاست — گنگ را گفتارِ سحبانی کجاست

چشم خاصانِ عرب گردیدہ کور — بر نیائی اے زہیر از خاک گور؟

اے تو مارا اندریں صحرا دلیل — شکن افسونِ نوائے جبرئیل

وہ حجر اسود سے کہتا ہے کہ تو ہماری ہاں میں ہاں کیوں نہیں ملاتا؟ ہبل سے کہتا ہے اے ہمارے معبودِ اکبر! تم کیوں نہیں اٹھ کر ان بے دینوں سے اپنا پرانا گھر چھین لیتے اور ان پر ہلّہ بول دیتے ہو؟ تم اپنے ساتھیوں کو لیکر آگے بڑھو یا کوئی آندھی بھیجدو جو انھیں تہس نہس کر کے رکھدے ——— اے لات و منات! خدارا تم ہمارے دیس کو چھوڑ مت جانا اور اگر

اس کے لئے مجبور بھی ہو جاؤ تو اللہ ہمارے دلوں سے مت جانا کوچ کرنا اور یہاں سے بھی جانا ہے تو کچھ اور ٹھہر جاؤ کہ تمہیں ایک نظر بھر کر دیکھ لیں:

باز گو اے سنگ اسود باز گوے آنچہ دیدیم از محمد باز گوے

اے ہبل! اے بندہ را پوزش پذیر خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

گلہ شان را بگرگاں کن سبیل تلخ کن خرمائے شاں را بر نخیل

صرصرے دہ با ہوائے بادیہ انھم اعجاز نخل خاویہ

اے منات اے لات ازیں منزل مرو گر ز منزل میروی از دل مرو!

اے ترا اندر دو چشم ما و ثاق

مہلتے "ان کنت ازمعت الفراق"[1]

---

[1] جاوید نامہ ۶۰-۵۸

ابوجہل کی نوحہ گری

جاہلیت کا سردار اور عربی قومیت کا علمبردار عمرو بن ہشام (ابوجہل) اسلامی عہد کے مکہ کی عالم خیال میں زیارت کرتا ہے جو ایمان و یقین کا مرکز اور توحید و رسالت کا گہوارہ بن چکا ہے اور اب اس کے حرم میں لات و منات کی جگہ ہر طرف طواف کرنے والے عبادت گزار اور زاہدینِ شب زندہ دار، رکوع و سجود، تسبیح و تہلیل، تحمید و تمجید اور ذکر و استغفار کے مبارک احوال میں نظر آتے ہیں اب نہ یہاں مادیت کے اصنام ہیں نہ جاہلیت کے بُت ہبل و عزیٰ، اُساف و نائلہ کی بڑائی اور دہائی کی جگہ اب مؤذن بلند آہنگ سے اس کے اونچے مناروں سے توحید و رسالت کی منادی کرتا اور ایک خدا کی کبریائی اور رسولِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کی ابدی رسالت کی گواہی دیتا ہے۔

جاہلی فخر و غرور، نخوت اور پندار تفوق، نسلی برتری اور امتیاز کی جگہ اب انسانی

مساوات اور اسلامی اخوت کا دور دورہ ہے اب لوگ بنی نوع انسان کو ایک برادری سمجھتے ہیں جس میں عرب و عجم سب برابر ہیں، شرف و عزت کا اگر کوئی حقیقی معیار ہے تو وہ صرف تقویٰ اور اخلاقی برتری ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم،

ابو جہل عربوں کی آوازوں پر کان لگاتا ہے تو کسی آنے جانے والے کی زبان سے قوم وطن اور خاندان سے متعلق فخریہ کلمات نہیں سنتا اس نے لوگوں میں گھوم پھر کر بھی دیکھا۔ لیکن اسے ایسا کوئی نہیں مل سکا جو کسی کو کسی پیشہ اور کسی ذاتی یا نسلی عیب کی وجہ حقیر جانتا ہو اور اسے چھیڑتا ہو۔ یا کالے اور گورے کی تمیز برتتا ہو۔ یا عرب کو عجم سے برتر سمجھتا ہو۔ وہ محفلوں اور مجلسوں میں جاکر بھی دیکھتا ہے تو عدنان و قحطان، ربیعہ و مضر، عبد مناف و عبد الدار، بنی ہاشم اور بنی عبد شمس کے درمیان کوئی خاندانی چشمک اور چپقلش ذرا بھی باقی نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ایک حبشی غلام کے گرد علم سیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑتے ہیں اور اس کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔ وہ عرب عوام کی ملاقاتوں، ان کے طور طریق، عادات و اخلاق ان کے فکر و عقیدہ کو بڑے غور سے دیکھتا ہے لیکن اس کے باوجود کوئی جاہلی رسم و رواج عربی عصبیت اور احساس قومیت اسے نظر نہیں آتا جس سے اس کا جی خوش اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

اسے معلوم ہوا کہ پرانی زندگی کے آثار بالکل مٹا دئے گئے ہیں اور ان کی جگہ عقیدہ و اخلاق، اور صلاح و تقویٰ کی بنیادوں پر ایک نیا معاشرہ وجود میں آگیا ہے پرانی قدریں اور پیمانے بالکل بدل گئے ہیں، اور ان کی جگہ نئے اخلاقی معیاروں نے لے لی ہے اس صورت حال سے اسے دکھ ہوتا ہے اور وہ حیرت و حسرت کے عالم میں یہ شعر پڑھتا ہوا سنا جاتا ہے۔

فما الناس بالناس الذین عهدتهم
ولا الدار بالدار التی کنت اعرف

(اب نہ وہ میرے شناسا لوگ ہیں اور نہ میرے جانے پہچانے وہ گھر ہی رہ گئے ہیں)

بنی مخزوم کا یہ سردار اپنے وطن میں اجنبی اور اپنے گھر میں پردیسی بن گیا ہے وہ اس مکہ کو بھی نہیں پہچان پا رہا ہے جہاں کا وہ معزز شہری اور رئیس تھا، وہ سوچتا ہے کہ کاش وہ بیت اللہ وہ حلیم، وہ حجر اسود، وہ بیر زمزم وہ قریشی سرداروں کی مجلس دکھائی دیتیں جن میں وہ مسلمانوں کو ستاتے اور چھیڑتے تھے ——— اور جن میں وہ بھی شریک ہوتا تھا، وہ اسلامی مکہ کو دیکھ کر کبھی سوچتا ہے کہ میں کہیں غلطی سے راستہ تو نہیں بھول آیا ہوں؟

اسے اپنی گزشتہ زندگی یاد آتی ہے جب وہ محمد کے دین جدید کو عربی قومیت اور قریشی عصبیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا اور اسلامی نظام کو نسب و وطن کے جاہلی نظام اور قریشی مملکت کے محدود دائرے کے لئے چیلنج جانتا تھا۔

وہ عزت و فضیلت کو صرف عربوں کی میراث سمجھتا اور دوسروں کو عجمی اور گنوار قرار دیتا تھا جو کسی قدردانی اور کسی رحم و کرم کے مستحق نہ تھے وہ اپنے خیالات کی وجہ سے جاہلیت کے دفاع میں اسی لئے سب سے آگے تھا وہ اسلام کے دوررس انقلابی نتائج کو پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اسے آخر اس حد تک کامیابی ہوگی کہ جاہلیت اپنے مرکز ہی میں غریب الدیار اور ناآشنائے روزگار ہو جائیگی ابوجہل انہی خیالات میں گم تھا اور جب یہ سلسلہ ٹوٹا تو اس میں ایک بار پھر جاہلی نخوت ابھری اور اسکی روح نے انگڑائی لی اور کعبہ سے لپٹ کر وہ محمد رسول اللہؐ کے خلاف دہائی دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ہمارا دل زخمی اور ہماری روح مجروح ہے، محمد نے کعبہ کا چراغ بجھا دیا اور اس کی قدر و منزلت خاک میں ملا دی انھوں نے قیصر و کسریٰ اور ملوک و سلاطین کے محلات کھنڈر بنا دئے اور ان الحکم الا للہ وان الارض للہ یورثھا من یشاء، کہہ کر ہمارا نظام کہنہ ہی ختم کر دیا انھوں نے ہمارے نوجوانوں پر ایسا سحر کیا کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے اور ان کے دین اور ان کی شخصیت کے

گرویدہ ہو کر رہ گئے۔ کیا لاالٰہ اللہ، سے بھی بڑھ کر کوئی کفر ہو سکتا ہے جسے پڑھنے کے بعد ایک خدا کے سوا دوسرے تمام خدا غیر معتبر ٹھہرتے ہیں جو قوموں کی تاریخ میں مذکور ہیں انھوں نے آبائی دین کا نام ہی مٹا کر رکھ دیا، لات ومنات کی عزت خاک میں ملا دی کاش دنیا ان سے اس کا بدلہ لیتی! عجیب بات ہے کہ انھوں نے محسوس اور مشہود خداؤں کو تو انکار کیا لیکن ان دیکھے خدا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اور ایمان بالحاضر کو ایمان بالغیب کے مقابلے پر کمتر بتایا آخر اس غیب کی اساس اور نامشہود کا وجود کیونکر مانا جا سکتا ہے؟ کیا غائب کو سجدہ کرنا سادہ لوحی اور وہم پرستی نہیں؟ کیا کسی غائب کے سامنے کسی آدمی کو سجدے میں وہ لذت مل سکتی ہے جو سنگ وخشت کے اصنامِ تراشیدہ کے سامنے ملتی ہے؟

سینۂ ما از محمد داغ داغ　　از دم او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود!　　نوجواناں را ز دستِ ما ربود!
ساحر و اندر کلامش ساحری ست　　ایں دو حرفِ لاالٰہ خود کافری ست

جاہلیت کی بازگشت

شاعر اسلام اقبال نے جاوید نامہ میں جہاں اپنی سیر سماوی کی سرگذشت لکھی ہے وہیں وادیٔ زہرہ میں اس محفل کی منظر کشی بھی کی ہے جہاں اقوام کے خدایان کہن، جمع تھے۔ جنکی جاہلی دور کے انسانوں نے پوجا کی تھی ان کے اصنام و مجسمے تراشے تھے اور ان کے نام پر ہیکل و معبد کی تعمیر کی تھی۔ ان اصنام کا اثر صرف وہم پرستوں ہی تک ہی نہ تھا بلکہ شعر و ادب میں بھی سرایت کر چکا تھا،

اس وادی میں ہر شہر و دیار اور ہر زمانے کے بت جمع ہوئے تھے مصریوں کے دیوتا بتع کے خدا، یمن کے آلہہ، جاہلیت کے معبود وادیٔ فرات کے پرورگار، وصل و فراق کی دیویاں چاند سورج اور مشتری کے ہمنام اصنام سبھی اس محفل میں آ گئے تھے۔ سب کی شکلیں بھی مختلف تھیں اور قوموں کے ذوق صنم گری کا پتہ دیتی تھیں کسی نے تلوار کھینچ رکھی تھی اور کسی نے سانپ کو گردن میں

حمائل کر رکھا تھا خیر ہئیت کچھ بھی ہو حالت سب کی یکساں تھی یعنی سب کے سب اس "وحی محمدی" سے کانپ اور تھرتھرا رہے تھے جس نے ان کے خلاف انقلاب و بغاوت کو ہوا دی تھی اور ان کا عیش حرام کر دیا تھا جس نے اصنام کو بے دخل کر کے توحید کی اساس پر ایک نئی دنیا آباد کی تھی۔ یہ تمام معبودانِ باطل ذکر جمیل سے خائف اور "ضرب خلیل" سے ناخوش تھے۔

شاعر کی اس ناگہانی زیارت کی "مردوخ" نے الٰہہ کو جب خوشخبری سنائی تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ مردوخ نے اسے اصنام کے حق میں فال نیک سمجھ کر ان سے کہنا شروع کیا "لو مبارک ہو! انسان پھر خدا سے بھاگ کر ادھر آیا ہے اور ادیانِ سماویہ کو ٹھکرا کر پھر سے ماضی کی خرافیات Mythology اور جاہلی روایات کی طرف علم و نظر کی وسعت، اور آثار قدیمہ کی تلاش اور ہماری عظمتوں کی دریافت کے لئے لوٹ رہا ہے یہ یقیناً امید کی ایک کرن ہے جو مدت کے بعد ہمارے ویرانے میں چمکی اور وہ بادِ مراد ہے جو ہماری محکوم سرزمین سے چلی ہے:

گفت مردوخ آدم از یزداں گریخت　　از کلیسا و حرم نالاں گریخت
تا بیفزاید بادراک و نظر!　　سوئے عہد رفتہ باز آید نگر!
روزگار افسانۂ دیگر گشاد،　　می وزد زاں خاکداں بادِ مراد

فینیقیوں اور کنعانیوں کے پرانے خدا البعل نے ہمیں سب سے پہلے خوش آمدید کہا اور خوشی میں گانے وہ کہنے لگا۔

انسان نے آسمانوں کو بھی دیکھ لیا مگر خدا وہاں بھی نہیں ملا یہ اس کا ثبوت ہے کہ انسان جس خدائی مذہب کا دعوا کرتا ہے وہ فریب تخیل سے زیادہ نہیں مذہب ایک خیال ہے اِدھر آیا اُدھر گیا، جیسے دریا میں موجیں اٹھتی ہیں اور پھر دوسرے ہی لمحے فنا ہو جاتی ہیں ——

انسان بغیر محسوس و مشہود خدا کے تسکین نہیں پا سکتا —— خدا فرنگ کو سلامت رکھے اس نے

مستشرقیوں کو خوب سمجھا اور علم و تحقیق و اکتشافات کے نام پر ہمیں ایک بار پھر زندہ کر دکھایا، دوستو اس سنہرے موقع کو غنیمت سمجھو جو مغرب کے سیاستدانوں نے ہمارے لئے فراہم کیا ہے۔

تم اس صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لو کہ اولادِ ابراہیم بھی عقیدہ توحید بھلا بیٹھی اور میثاق ازل اور پیمانِ الست کو فراموش کر چکی اور اس کی لذت کھو بیٹھی۔ وہ فرنگ کے فیضِ صحبت سے اپنا سب کچھ لٹا چکی اور روح الامین کے آوردہ دین اور لذتِ ایمان و یقین کو یکسر حوالۂ نسیاں کر چکی:

آدم آں نیلی تتق را بر درید — آنسوئے گردوں خدائے را ندید
در دلِ آدم بجز افکار چیست — ہمچو موج ایں سر کشید و آں رمید
جانش از محسوس می گیرد قرار — بو کہ عہد رفتہ باز آید پدید
زندہ باد افرنگیٔ مشرق شناس — آں کہ مارا از لحد بیروں کشید
در نگر آں حلقۂ وحدت شکست — آل ابراہیم بے ذوقِ الست
مرد حر افتاد در بندِ جہات — با وطن پیوست و از یزداں گسست
خونِ او سرد از شکوہ دیریاں — لاجرم پیر حرم زنار بست

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

ہبل کہتا ہے" وہ مومن آزاد جو حدود و قیود اور جہات کا کبھی قائل نہ تھا اور نہ خدائے خالقِ کائنات کے سوا کسی کو جانتا تھا اب وطن سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ اسے پوجتا بھی ہے اس کیلئے لڑتا بھی ہے لیکن خدا کو کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا۔

آج سارا عالم اسلام دانش فرنگ کا اسیر ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ علماء شیوخ بھی تقلید مغرب پر اتر آئے ہیں یہ ہمارے لئے سنہرا موقع اور ساعتِ سعید ہے ہمیں آج

خوشی منانے کا حق ہے کہ دین نے شکست کھائی اور قومیت و وطنیت کی فتح ہوئی اور محمد کے ایک چراغ کے لئے سیکڑوں بولہبی آندھیاں امنڈنے لگیں ہم "لا الٰہ الا اللہ" کی آواز سنتے ہیں لیکن وہ دل کی آواز نہیں بلکہ حرف زیر لب سے آگے کچھ نہیں۔ اور جو دل میں نہیں ہوتا وہ زبان پر بھی زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ سحر فرنگ نے دنیا پر ایک بار پھر تاریکی کی حکومت مسلط کر رکھی ہے اور دین کو بے دخل بنا دیا ہے ہمارے وہ پیرو بہت اچھا کر رہے ہیں۔ جو دنیا چھوڑ کر خلوتوں اور غاروں میں جا بیٹھے ہیں۔ ہم نے اپنے بندوں کو مطلق تصرف اور کامل آزادی دے رکھی تھی اور طاعت و عبادت کے بوجھ سے انھیں سبکدوش رکھا تھا۔ ہم نے سنجیدہ عبادت کے بدلے گانے اور بھجن کو رواج دیا تھا اور رقص و سرود کو ہی مقدس بنا دیا تھا۔ ہم اس بے مزہ نماز کے قائل نہ تھے جس میں نغمہ و موسیقی نہ ہو ہمارا اثر انسانوں پر اب تک باقی ہے اور وہ غیر مشہود خدا پر موجود و مشہود بت کو ترجیح دیتے ہیں۔ :

در جہاں باز آمد ایام طرب — دیں ہزیمت خوردہ از ملک و نسب

از چراغ مصطفےٰ اندیشہ چیست — زانکہ او را پف زند صد بولہب!

گرچہ می آید صدائے لا الٰہ، — آنچہ از دل رفت کے ماند بلب

اہرمن را زندہ کرد افسونِ غرب — روز یزداں زرد رو از بیم شب

بند دیں از گردنش باید کشود — بندۂ ما بندۂ آزاد بود!

تا صلوٰت او را گراں آید ہمی — رکعتے خواہم و آں ہم بے سجود

جذبہ ہا از نغمہ می گردد بلند — پس چہ لذت در نمازِ بے سرود؟

خوشتر آں دیوے کہ آید در شہود　　　　از خداوندے کہ غیب اوراسزد

اے خدایانِ کہن وقت ست وقت![1]

---

[1] جاوید نامہ ۱۰۳-۱۰۱

ایک لمحہ، جمال الدین افغانیؒ کیساتھ

اقبال نے پیر رومی کے ساتھ اپنی فکری اور روحانی سیاحت میں ماضی کی عظیم شخصیات، ارباب مذاہب و فلسفہ، اور سیاسی لیڈروں اور ادبی تحریکوں کے علمبرداروں سے ملاقاتیں کیں اور پھر اس اچھوتی وادی میں پہنچے جہاں آدمی کے قدم نہیں پہنچے تھے اس میں فطرت کا جمال اپنی اصل و حقیقت کے ساتھ موجود تھا، پہاڑ اور میدان، چمن زار اور آبشار سب دل کو موہ رہے تھے شاعر کو تعجب ہوا کہ یہ دنیائے رنگ و نور ہزاروں سال سے انسانی تمدن اور صنعتی سرگرمیوں سے خالی ہی چلی آرہی ہے۔

جمالِ فطرت فضا کی لطافت، آبشاروں کے ترنم و تکلم، اور وادی کی دلبری و رعنائی نے شاعر کو بہت متاثر کیا۔ اسی اثناء میں وہ اپنے شیخ رومی کی طرف متوجہ ہو کر دور سے آنیوالی آواز اذاں پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ میرے کان غلط تو نہیں سن رہے ہیں رومی ان سے تسلی

دینے کے انداز میں کہتے ہیں کہ یہ تو صلحا اور اولیا ہی کی وادی ہے اور اس سے ہمارا بھی قریبی رشتہ ہے اسلئے کہ حضرت آدمؑ نے جنت سے نکلنے کے بعد ایک دو دن یہیں قیام فرمایا تھا اس سرزمین نے ان کی آہِ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی کی صدا سنی ہے اس میں ان کے اشکِ ندامت جذب ہوئے ہیں۔ اس کی زیارت کے لئے بلند مقام لوگ اور فضیل و بو سعید، جنید و بایزید جیسے اولیا ہی ہمت کرتے ہیں آؤ ہم اس مقدس وادی میں وہ نمازِ شوق ادا کریں جس سے مادی دنیا میں اب تک محروم تھے۔

دونوں آگے بڑھتے ہیں اور دو آدمیوں کو نماز پڑھتے دیکھتے ہیں جس میں ایک افغانی ہے اور ایک ترک۔ امام جمال الدین افغانی ہیں اور ان کے مقتدی سعید حلیم پاشا۔ رومی اقبال سے کہتے ہیں کہ مشرقی ماؤں نے ان دونوں سے بڑھ کر کسی کو نہیں جنا۔ ان کے فکر و نظر نے مشرقی سیاسیات کی کامیاب رہنمائی کی لیکن خاص طور سے افغانی نے مشرق کے مردِ بیمار میں روحِ نشاط پھونک دی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیداری کی لہر دوڑا دی۔ سعید حلیم پاشا قلبِ دردمند اور فکرِ ارجمند کے مالک تھے ان کی روح جتنی بے تاب تھی اتنی ہی ان کی عقل روشن اور راہ یاب ان کے پیچھے پڑھی ہوئیں دو رکعتیں عمروں کی عبادت و ریاضت سے بڑھ کر ہیں۔

سید جمال الدین نے سورۂ والنجم پڑھی، زمان و مکان کی مناسبت، امام کی پرسوز شخصیت قرآن کے جمال اور قرأت کی موزونیت نے سوز و اثر کی عجیب فضا پیدا کر دی جس میں آنکھیں اشکبار اور دل بیقرار ہو اٹھے، یہ مسحور کن قرأت اگر حضرت ابراہیمؑ و جبرئیلؑ بھی سنتے تو لطف اندوز ہوتے اور اس کی داد دیتے۔ ان کی آواز میں وہ تاثیر تھی کہ مردے جی اٹھیں قبروں سے "الا اللہ" کے نعرے بلند ہونے لگیں اور حضرت داؤد بھی سوز و مستی کا پیغام سنیں یہ قرأت ہر پردگی کو آشکارا اور اسرارِ کتاب کو بے حجاب کر رہی تھی۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے نماز کے بعد ادب و محبت سے ان کے ہاتھ چومے اور رومی نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ سیلانی کسی منزل پر ٹھہرتا ہی نہیں اور اپنے دل میں تمناؤں کی ایک دنیا لئے پھرا کرتا ہے، یہ مرد آزاد اپنے سوا کسی کا قائل نہیں، قلندری و بے باکی اس کا پیشہ اور اس کی زندگی ہے میں اسی لئے اسے "زندہ رود" کہتا ہوں۔

افغانی ان سے خاکدانِ عالم کے احوال پوچھتے ہیں اور خاک نژاد لیکن نوریں نہاد۔ مسلمانوں ـــــ کے بارے میں بیتابی سے سوال کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ سیدی! یہ امت جو تسخیر کائنات کے لئے اٹھی تھی اب دین و وطن کی کشمکش میں مبتلا ہے اب ایمان کی طاقت اور روح کی قوت اس میں باقی نہیں اور دین کی عالمگیری پر بھی اسے چنداں اعتبار نہیں اس لئے قومیت و وطنیت کے سہارے لے رہی ہے ترک و ایرانی مئے فرنگ سے مخمور اور اس کے مکروفریب سے شکستہ و رنجور ہیں اور مغربی قیادت نے مشرق کو زار و نزار بنا دیا ہے اور دوسری طرف اشتراکیت دین و ملت کی عزت سے کھیل رہی ہے:

روح در تن مردہ از ضعفِ یقیں — نا امید از قوتِ دینِ مبیں!

ترک و ایران و عرب مستِ فرنگ — ہر کسے را در گلو شستِ فرنگ

مشرق از سلطانیٔ مغرب خراب — اشتراک از دین و ملت بردہ تاب

افغانی نے یہ سب صبر و سکون لیکن حزن و الم کے ساتھ سنا اور وہ پھر یوں گویا ہوئے

• عیار فرنگ نے اہل دین کو قوم و وطن کی پٹی پڑھائی وہ اپنے لئے تو ہمیشہ مرکز اور نو آبادیات کی فکر میں رہتا ہے لیکن تم میں پھوٹ ڈالے رہنا چاہتا ہے اس لئے تمہیں ان حدود سے نکل کر آفاقی اور عالمی رول ادا Play کرنا چاہئے۔ مسلمان کو ہر ملک کو اپنا وطن اور ہر زمین کو اپنا گھر سمجھنا چاہئے۔ اگر تم میں شعور ہے تو تمہیں جہانِ سنگ و خشت سے بلند ہو کر سوچنا ہوگا

دین انسان کو مادیات سے اٹھا کر اسے عرفان نفس سکھاتا ہے۔ جو انسان "اللہ" کو پالیتا ہے وہ پوری دنیا میں بھی نہیں سما سکتا اور کائنات بھی اسے تنگ محسوس ہوتی ہے، گھاس پھوس مٹی سے نکلتے ہیں اور مٹی ہی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن عظمت انسانیت کا یہ انجام نہیں، آدم خاکی ہیں لیکن ان کی روح افلاکی ہے انسان کا ظاہر زمین کی طرف مائل ہے لیکن اس کا اندروں کسی اور ہی عالم کا قائل ہے۔ روح مادی پابندیوں سے گھبراتی ہے اور حدود و قیود سے ناآشنا ہی رہتی ہے جب اسے وطینت کی مٹی میں بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا دم گھٹنے اور اس کی سانس رکنے لگتی ہے ــــــ شاہین و شہباز پنجروں میں کیا آشیانوں میں بھی کبھی رہنا گوارا نہیں کرتے

یہ مشتِ خاک جسے ہم وطن کہتے اور مصر و شام و عراق و یمن نام دیتے ہیں ان کے درمیان یقیناً یہ رشتہ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ یہیں تک بند ہو کر رہ جائیں اور آنکھیں کھول کر دنیا کو نہ دیکھیں، سورج، مشرق سے نکلتا ہے لیکن وہ مشرق و غرب دونوں کو منور اور مسخر کر کے رہتا ہے اس کی فطرت حدود سے بے نیاز ہے اگرچہ اس کا طلوع و غروب حدود کے اندر ہی ہوتا ہے:

چیست دیں برخاستن از روئے خاک　　تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک
می نگنجد آنکہ گفت اللہ ہو　　در حدودِ ایں نظام چار سو
گفت تن در شو بخاک رہ گذر　　گفت جاں پہنائے عالم را نگر
جان نگنجد در حیات اے ہوشمند　　مردِ حر بیگانہ از ہر قید و بند
گرچہ از مشرق برآید آفتاب　　با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
فطرتش از مشرق و مغرب بری ست　　گرچہ او از روئے نسبت خاوری ست

افغانی نے مزید فرمایا کہ اشتراکیت اس یہودی کی دماغی اپج ہے جس نے حق و باطل کو خلط ملط کر دیا ہے جس کا دماغ کافر لیکن دل مومن تھا۔ یہ مغرب کا المیہ ہے کہ ان سے روحانی قدریں اور غیبی حقائق کھو کر انھیں معدہ اور مادہ میں تلاش کرنا چاہا حالانکہ روح کی قوت و حیات کا تعلق جسم سے نہیں۔ لیکن شیوعیت بطن و معدہ اور تن و شکم سے آگے بڑھتی ہی نہیں مارکس Karl Marx کا یہ مذہب مساواتِ شکم پر قائم ہے حالانکہ انسانی اخوت جسمانی مساوات پر نہیں بلکہ ہمدردی و مواسات اور محبت و مروت پر تعمیر ہوتی ہے:

غربیاں گم کردہ اند افلاک را　　در شکم جویند جانِ پاک را!
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک　　جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس　　بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است　　بیخ او در دل نہ در آب و گل است

افغانی نے ملوکیت کے بارے میں فرمایا ملوکیت کا جسم و ظاہر بہت خوشنما ہے لیکن اس کا دل تاریک اور روح نحیف و نزار اور اس کا ضمیر بالکل مردہ ہے وہ شہد کی مکھی کی طرح ہر پھول پر بیٹھتی ہے اور اس کا رس چوس لیتی ہے اس سے پھولوں کے رنگ میں فرق نہیں آتا لیکن ان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ کاغذی پھول بن کر رہ جاتے ہیں، ملوکیت بھی اسی طرح افراد و اقوام کو اپنا شکار بناتی اور ان کا خون چوس کر ہڈی چمڑا چھوڑ دیتی ہے ——

ملوکیت اور اشتراکیت کے لئے حرص و ہوس، خدا بیزاری اور مردم آزاری، قدرِ مشترک اور Commonwealth کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زندگی اگر اشتراکیت میں "خروج" ہے تو ملوکیت میں "خراج" اور انسان ان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پارۂ زجاج! اشتراکیت علم و فن اور مذہب کی قاتل ہے تو ملوکیت عوام کی دشمن مادیت دونوں کا مشترکہ مذہب ہے، دونوں

کا ظاہر معصوم لیکن باطن مجرم ہے۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب ہر دو یزداں ناشناس، آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج درمیانِ ایں دو سنگ، آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست آں برد جاں را ز تن، ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن در گلے تخم دلے انداختن!

افغانی کہتے ہیں کہ قرآن کی تعلیمات دوسری ہیں اور مسلمانوں کا عمل دوسرا ہے۔ ان کی زندگی کا شرارہ بجھ چکا اور ان کا حضورؐ سے تعلق ختم ہو چکا ہے۔ آج مسلمان اپنی زندگی اور معاشرے کی اساس قرآنی ہدایات پر نہیں رکھتا اس کے نتیجے میں وہ دین و دنیا دونوں میں پسماندہ رہ گیا ہے اس نے قیصر و کسریٰ کا نظام استبداد توڑ دیا لیکن خود ملوکیت کا علمبردار بن گیا اور عجمی سیاسیات کو اپنا لیا اور زندگی کا نقطہ نظر ہی بدل ڈالا:

در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد!
خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

افغانی ملت روسیہ کو پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم نے بھی مسلمانوں کی طرح قیصر و کسریٰ کا نظام ختم کیا ہے تمہیں مسلمانوں سے عبرت لینا چاہیئے۔ اور زندگی کے معرکے میں عزم و ثبات سے قائم رہنا۔ اور ملوکیت و وطنیت کے اصنام کو شکستہ کرنے کے بعد انھیں اب بھولے سے بھی یاد نہیں کرنا چاہیئے۔ آج دنیا کو اس امت کی ضرورت ہے جو وعد و وعید رحمت و شدت، نرمی و گرمی دونوں رکھتی ہو۔ تم مشرق سے روحانیت و مذہبیت لو کیونکہ مغربی

مذہب پرستی کھوکھلی ہو چکی ہے اب ان گڑے مردوں کو سرگزمت اکھیڑنا تو نے خدایانِ باطل کا انکار کر کے مرحلۂ نفی طے کر لیا ہے۔ اب "الا اللہ" کی اثباتی مہم بھی تمہیں سرانجام دینا چاہیئے اس طرح تمہارا کارنامہ مکمل اور سفر تمام ہو سکے گا تمہیں عالمی نظام کی فکر ہے تو اس کے لئے پہلے محکم اساس تلاش کرو اور وہ اساس دین وعقیدہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

تم نے خرافیاتِ عالم کی سطر سطر مٹا دی ہے اس لئے تمہیں اب قرآن کا حرف حرف پڑھنا چاہیئے۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ قرآن ملوکیت و آمریت کا جانی دشمن اور سرمایہ داری کی موت ہے اور غلاموں، مزدوروں اور مجبوروں کے لئے زندگی، وہ ضرورت سے زائد سرمایہ کو غریبوں پر خرچ کرنے کی تاکید کرتا ہے وہ سود کو حرام اور تجارت کو حلال کیا اور قرض حسنہ اور صدقۂ جاریہ پر لوگوں کو ابھارتا ہے کیا دنیا کے فتنوں اور بے رحمیوں کا سرچشمہ سود نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ زمین سے نفع حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن ملکیت خدا کی ہے اس لئے وہ امین اور وارث ہے مالک مطلق نہیں (وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ) بادشاہوں نے حق کا علم سرنگوں کر دیا اور خدا کی دنیا ان سے پامال ہو گئی ہے۔ قرآن حق وصداقت کی آواز بلند کرتا اور کہتا ہے کہ ابن آدم کے لئے زمین ایک وسیع دسترخوان ہے اور کل نوع انسانی ایک خاندان (وما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ) اسی لئے جب قرآنی حکومت قائم ہوئی تو غلو پسند راہب اور سنیاسی چھپ گئے اور پاپائیت اور کلیسا کا طلسم ٹوٹ گیا۔ قرآن صرف ایک کتاب ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بہت کچھ ہے وہ انسان کو بدلتا ہے اور پھر کائنات کو بدل دیتا ہے یہ وہ زندہ کتاب ہدایت وسعادت ہے وہ قلب کائنات کی دھڑکن اور مشرق ومغرب کا مامن ہے اس سے مشرق و مغرب دونوں ہی کی تقدیر بندھی ہوئی اور انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے۔

تو نے نیا قانون و آئین بنایا ہے اس لئے تمہیں چاہیئے کہ دنیا پر ذرا قرآن کی روشنی میں

بھی ایک نظر ڈال کر دیکھو کہ زندگی کی حقیقت سمجھ سکو:

باسیہ فاماں یدبیضا کہ داد؟ — مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد؟
جز بقرآں ضیغمی روباہی ست — فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر
چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
رزق خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویاست ایں
اندرو تقدیرہائے شرق و غرب — سرعتِ اندیشہ پیدا کن چوں برق
با مسلماں گفت جاں برکف بنہ — ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ!
آفریدی شرع و آئینے دگر! — اندکے با نورِ قرآنش نگر!

از بم و زیرِ حیات آگہ شوی
ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی![1]

---

[1] جاوید نامہ ۹۱-۶۳

اقبال درِ دولت پر[1]

ڈاکٹر محمد اقبال کی پوری زندگی عشق رسول ؐ اور یاد مدینہ سے معمور تھی، ان کا زندہ جاوید کلام ان دونوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے لیکن زندگی کے آخری ایام میں یہ پیمانۂ عشق اس طرح لبریز ہوا کہ مدینہ کا نام آتے ہی اشک محبت بے ساختہ جاری ہوجاتے وہ اپنے اس کمزور جسم کے ساتھ یقیناً مدینۃ الرسول میں حاضر نہ ہوسکے لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل، نیز اپنی قوت تخیل اور زور کلام کے ساتھ انھوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور ان کا طائرِ فکر ہمیشہ اسی آشیانہ یا آستانہ پر منڈلاتا رہا۔

---

[1] یہ اس عربی تقریر کا ترجمہ ہے جو "اقبال فی مدینۃ الرسول ؐ" کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں دمشق ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی تھی۔ ترجمہ مولوی محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے قلم سے ہے۔

انھوں نے رسول اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اپنے دل، اپنی محبت، اپنے اخلاص اور اپنی وفا کی نذر پیش کی اور آپ کو مخاطب کرکے اپنے جذبات و احساسات اپنی ملت اور اپنے معاشرہ کی دل گداز تصویر کھینچ کر رکھ دی، ایسے مواقع پر ان کے جوہر شاعری خوب کھلتے تھے اور معانی کے سوتے پھوٹ پڑتے تھے وہ حقائق جن کی زمام مضبوطی سے انھوں نے گرفت میں رکھی تھی اس وقت بے حجاب و بے نقاب ہو کر سامنے آتے اور اپنا خوب رنگ دکھاتے۔

بحر فے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوق حضوری طول دادم داستانے را

اس موضوع پر ان کا کلام سب سے زیادہ جاندار، طاقتور، مؤثر ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی، ان کے تجربات کا نچوڑ، ان کے عہد کی تصویر اور ان کے نازک ترین احساسات کا آئینہ دار ہے۔

آگے ان کے جو اشعار پیش کئے جائیں گے ان میں انھوں نے عالم خیال میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کیا ہے اور اس تصور کے ساتھ وہ قافلۂ شوق کے ساتھ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں، ذوق حضوری اور شوق و محبت میں یہ ریت ان کو ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہو رہی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر ذرہ دل بن کر دھڑک رہا ہے، وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ ان دھڑکتے ہوئے دلوں کا خیال کرے اور نرم روی اختیار کرے:

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خنداست — شبش کوتاہ و روز او بلند است
قدم اے راہ رو آہستہ تر نہ — چو ما ہر ذرۂ او دردمند است

حدی خواں کا نغمہ سن کر ان کی آتش شوق اور تیز ہونے لگتی ہے، دل کی جراحتیں

تازہ ہو جاتی ہیں، ان کے پورے وجود میں حرارت اور زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور ان کا سازِ دل درد و اثر میں ڈوبے ہوئے موثر اور بلیغ اشعار کے ساتھ نغمہ زن ہونے لگتا ہے۔

پھر وہ اسی عالم تصور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مواجہ شریف میں حاضر ہوتے ہیں، درود و سلام پڑھتے ہیں، محبت و شوق کی زبان ان کے دل کی ترجمان بن جاتی ہے اور وہ اس مبارک و قیمتی ساعت سے فائدہ اٹھا کر اپنا حالِ دل بیان کرتے ہیں امت اسلامیہ اور عالم اسلام کے حالات، اس کے مسائل اور مشکلات، اس کی آزمائشیں اور امتحانات نیز مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے اس کی سپر افگنی اور بے لبسی اپنے وطن میں اس کی غریب الوطنی اور خود اپنی قوم میں اپنے پیغام کی نا قدری کا شکوہ کرتے ہیں۔ کبھی ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور کبھی دل کی بات زبان پر آجاتی ہے۔

اس مجموعہ اشعار کا نام انھوں نے "ارمغان حجاز" رکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ پورے عالم اسلام کے لئے بہت مبارک تحفہ اور نسیم حجاز کا ایک مشکبار جھونکا ہے۔

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رُخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

اقبال کا یہ روحانی سفر اس زمانہ میں ہوا جب ان کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی اور ان کے قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اس سن میں جب لوگ آرام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور گوشہ نشینی پسند کرتے ہیں، ان کو جس چیز نے اس طویل و پُر مشقت سفر پر آمادہ کیا اس کو فرمانِ محبت کی تعمیل اور مقصد زندگی کی تکمیل کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

بایں پیری رہ یثرب گرفتم ۔۔۔ نوا خواں از سرور عاشقانہ

چو آں مرغے کہ در صحرا سر شام ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

وہ کہتے ہیں کہ اس وقت جب کہ میری زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے اگر میں نے مدینہ منورہ کا (جو روح کا اصل مسکن اور مومن کا حقیقی نشیمن ہے) قصد کیا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے، جس طرح شام کے وقت چڑیاں اپنے اپنے آشیانہ کی طرف جاتی ہیں اسی طرح میری روح بھی اب اپنے حقیقی آشیانہ کی طرف واپس جانا چاہتی ہے

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان جب ان کی اونٹنی اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ سوار بہت خستہ و بیمار ہے، لیکن ناقہ ان کے اس مشورہ کو قبول نہیں کرتا۔ وہ ایسا مستانہ وار قدم رکھتا ہے گویا یہ ریگ زار نہیں بلکہ ریشم کا ایک فرش بچھا ہوا ہے۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است

قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بپائش ریگ ایں صحرا حریر است

اب یہ کاروانِ مدینہ درود و سلام کی سوغات لئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے اس پُر کیف فضا میں وہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کو اس گرم ریت پر ایک ایسا سجدہ میسر ہو جو ان کی پیشانی کے لئے نقش دوام بن جائے وہ اپنے دوستوں کو بھی اسی سجدۂ شوق کا مشورہ دیتے ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ در وے کاروانہا ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ درودے خواند و محمل براند

بہ ریگ گرم او آور سجودے ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ جبیں را سوز تا داغے بماند

ذوق و شوق کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے تو عراقیؔ اور جامیؔ کے اشعار بے ساختہ ان کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، لوگ حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں کہ یہ عجمی آخر کس زبان میں اشعار

پڑھ رہا ہے جو سمجھ میں تو نہیں آتے لیکن دل کو درد و محبت سے اس طرح بھر دیتے ہیں کہ آدمی کو کھانے پینے کا بھی ہوش باقی نہیں رہتا اور پانی کے بغیر بھی اس کی تشنگی دور اور خستگی کافور ہو جاتی ہے۔

امیر کارواں آں عجمی کیست — سرودِ او بآہنگ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابیٔ او — خنک دل در بیابانے تواں زیست

راستہ کی دشواریوں اور مشقتوں میں ان کو لطف آنے لگتا ہے، شب بیداری کم خوابی اور بے آرامی سے سرور حاصل ہوتا ہے، وہ اس راستہ کو طویل نہیں سمجھتے اور جلد پہنچنے کی آرزو نہیں کرتے بلکہ اپنے ساربان سے اس کی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس سے بھی زیادہ دور دراز راستہ سے لے چلے تاکہ اس بہانہ سے ذوق شوق کی مدت بھی کچھ دراز ہو سکے اور انتظار کا لطف (جو عشاق کا زادِ سفر اور محبین کا سرورِ نظر سمجھا گیا ہے) دوبالا ہو سکے۔

غم راہی نشاط آمیز ترکن — فغانش راجنوں انگیز ترکن
بگیر اے ساربان راہِ درازے — مرا سوزِ جدائی تیز ترکن

اسی سرور و شوق اور کیف و مستی کے ساتھ وہ سارا راستہ طے کرتے ہوئے مدینۂ طیبہ پہنچتے ہیں۔ اور اپنے رفیق سفر سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی زلف کے اسیر ہیں آج ہم کو اپنے دل کی مراد برلانے اور اپنے آقا اور محبوب کے قدموں پر اپنی پلکیں بچھانے کا موقع ملا ہے اس لئے آج ہمیں اپنی آنکھوں پر سے پابندی ہٹا لینی چاہیئے اور اس سیلاب اشک کو جو عرصہ سے امنڈنے کے لئے بے چین ہے تھوڑی دیر کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم — من و تو کشتۂ شانِ جمالیم

دو حرفے بر مرادِ دل بگوئم　　　بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

وہ اپنے اوپر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا خوش نصیبی اور مقام مسرت ہے کہ یہ سعادت اور نعمت ان کے نصیب میں آئی۔ اور اس گدا کو اپنی نااہلی کے باوجود اس دربار شاہی میں نوازا گیا جہاں بڑے بڑے دانشوروں اور اورنگ نشینوں کو توفیق باریابی حاصل نہ ہوسکی

حکیماں را بہا کمتر نہادند　　　بناداں جلوۂ مستانہ دادند

چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے　　　درِ سلطاں بہ درویشے کشادند

لیکن اس سرور و مستی اور جذب و شوق میں بھی وہ امت مسلمہ اور ملت اسلامی ہند کو فراموش نہیں کرتے اور پوری صدق بیانی اور قادر الکلامی کے ساتھ اس کا دردِ دل کتاب کی طرح کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

مسلماں آں فقیر کج کلاہے　　　رمید از سینۂ او سوز آہے

دلش نالد چرا نالد نداند　　　نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

وہ کہتے ہیں کہ اس امت کی بڑی آزمائش یہ ہے کہ یہ بام بلند سے گری ہے اور جو جتنے اوپر سے گرتا ہے اتنی ہی اس کو چوٹ آتی ہے۔

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے　　　مسلمانے بہ گوہر ارجمندے

خدا ایں سخت جاں را یار بادا　　　کہ افتاد است از بام بلندے

وہ کہتے ہیں کہ اس امت کی پریشاں روزگاری اور اس کی بے نظمی و بدحالی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت ہے اور امام نہیں، افراد ہیں اور نظام نہیں،

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است　　　ہنوز ایں کارواں دور از مقام است

زکارِ بے نظام او چہ گویم　　　تو می دانی کہ ملت بے امام است

وہ کہتے ہیں کہ اس کے خون میں اب وہ "تب وتاب" اور اس کے اندر وہ مردم خیزی کی صلاحیت باقی نہیں رہی جو اس کا طرۂ امتیاز تھا اب عرصہ سے اس کی نیام بے شمشیر اور اس کی "کشت ویران" لالہ وگل سے محروم ہے:

نماند آں تاب وتب درخون نابش نروید لالہ از کشت خرابش
نیام او تہی چوں کیسۂ او بطاق خانہ ویراں کتابش

وہ کہتے ہیں کہ یہ امت اپنے سرمایہ آرزو اور ذوق جستجو سے محروم ہو کر رنگ وبو میں گرفتار ہو گئی ہے، اس کے کان نرم ونازک نغموں کے خوگر ہو گئے ہیں اور مردانِ حُر کی آواز اس کے لئے نامانوس ہو چکی ہے:

دلِ خود را اسیر رنگ وبو کرد تہی از ذوق و شوق آرزو کرد
صفیر شاہبازاں کم شناسد کہ گوشش با طنین پشہ خو کرد

اب نہ وہ اس کی آنکھ میں یقین کا نور اور عشق کا سرور ہے نہ اس کا دل کسی کی محبت میں مخمور اور اس کا سینہ کسی کی یاد سے معمور ہے، وہ حضوری سے بہت دور اور منزل مقصود سے ناآشنا اور مہجور ہے۔

بچشم او نہ نور و نے سرور است نہ دل در سینۂ او ناصبور است
خدا ایں امتے را یار بادا کہ مرگِ او ز جانِ بے حضور است

پھر وہ اس کے شاندار ماضی کا موازنہ (جب اس پر لطف وعنایت کی نظر خاص تھی) اس داغ دار حال سے کرتے ہیں۔ وہ بڑی بلاغت اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہتے ہیں کہ جس کو آپ نے پھلوں اور میووں پر پالا ہو اور ناز ونعم میں رکھا ہو وہ آج ان صحراؤں میں اپنا رزق تلاش کرنے اور در بدر بھٹکنے پر مجبور ہے۔

مپرس از من کہ احوالش چنان است   زمینش بدگہر چوں آسمان است

برآں مرغے کہ پروردی بانجیر   تلاش دانہ در صحرا گران است

وہ لادینیت کے اس طوفان بلاخیز کا ذکر کرتے ہیں جو عالم اسلام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال (جو خود فلسفہ سیاسیات اور اقتصادیات کے غواص تھے اور اس کا کوچہ کوچہ ان کا دیکھا ہوا تھا) اچھی طرح سمجھتے تھے کہ عالم اسلام میں لادینیت کا سب سے بڑا راستہ "خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر" "روحانی خلا" اور "قلب کی برودت" ہے مسرفانہ اور استقراطی زندگی سے اس میں اور مدد مل رہی ہے، وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ لادینیت کے اس سیلاب اور مادہ پرستانہ معاشی فلسفہ کا مقابلہ اگر کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ زہد اور محبت ہے اس پر اگر کوئی چیز غالب آسکتی ہے تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زاہدانہ اور عاشقانہ زندگی ہے وہ مسلمانوں کے لئے اس مثالی زندگی کی آرزو کرتے ہیں جو زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہو وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایسی زندگی وجود میں آجائے تو ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکانے اور اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوگی۔

دگرگوں کرد لادینی جہاں را   ز آثار بدن گفتند جاں را

ازاں فقرے کہ با صدیق دادی   بشورے آور ایں آسودہ جاں را

وہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب فقر و افلاس اور مادی وسائل کی کمی کو نہیں سمجھتے ہیں بلکہ اس کی توجیہ اس "شعلہ زندگی" کی افسردگی سے کرتے ہیں جو کسی عہد میں ان کے سینہ کے اندر فروزاں تھا۔

وہ کہتے ہیں جب یہ درویش اور فقیر ایک اللہ کے لئے سجدہ ریز تھے اور کسی اور کا اقتدار اور اختیار تسلیم نہیں کرتے تھے، اس وقت شہنشاہوں کا گریبان ان کے ہاتھ میں تھا،

لیکن جب یہ شعلہ سرد ہوگیا تو ان کو درگاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لینی پڑی۔

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند　　گریبان شہنشاہاں دریدند
چو آں آتش درون سینہ افسرد　　مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

وہ مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کا ایک ایک ورق الٹ کر دیکھتے ہیں اس میں ان کو جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں جن سے ایک مسلمان کا سر شرم و ندامت سے جھک جائے، بہت سی ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جن کو نبوت محمدی، اس کی تعلیمات اور اس کی اعلیٰ قدروں اور اصولوں سے کوئی مناسبت نہیں، ان کو بہت سی مشرکانہ باتیں، غیر اللہ کی پرستش، جابر و ظالم بادشاہوں اور حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی مدح سرائی کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جن سے ایک غیور اور خود دار انسان کی پیشانی عرق آلود ہونے لگتی ہے۔ اقبال خاموشی کے ساتھ ایک ایک چیز دیکھتے جاتے ہیں اور آخر میں بڑی صراحت اور اعتراف لیکن بڑی بلاغت اور اختصار کے ساتھ کہتے ہیں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان پستیوں کے ساتھ ہم ہرگز آپ کے شایان شان نہ تھے، ہمارا انتساب آپ کی طرف آپ کی شان میں کھلی بے ادبی ہے۔

ننالم از کسے می نالم از خویش
کہ ما شایان شانِ تو نبودیم

وہ عالم اسلام پر جو ان کا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا ہے احتیاطاً دوبارہ ایک نظر ڈالتے ہیں اور اپنے جائزہ کا حاصل یہ بتاتے ہیں کہ ایک طرف خانقاہوں کا سبو خالی ہے، دوسری طرف دانش گاہیں جدت و جرأت سے عاری ہیں، ان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ طے کئے ہوئے سفر کو بار بار طے کرتی ہیں ادب و شاعری مردہ و بے روح اور دلی جذبات سے

محروم ہیں۔

سبوئے خانقاہاں خالی از مے　　　　کند مکتب رہِ طے کردہ را طے

زبزم شاعران افسردہ رفتم　　　　نواہا مردہ بیروں افتد از نے

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دنیائے اسلام کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ مسلمان مجھے نہ ملا جو موت سے لرزہ براندام ہونے کے بجائے موت اس سے لرزہ براندام ہو اور جو خود موت کے لئے پیام موت ہو۔

باں بالے کہ بخشیدی پریدم　　　　بسوز نغمہائے خود تپیدم

مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد　　　　جہاں گردیدم و اور اندیدم

وہ مسلمانوں کی پریشاں خاطری، آشفتہ سری اور آوارہ گردی کا راز فاش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر وہ فرد یا جماعت جو دل تو رکھتی ہے لیکن دلبر نہیں رکھتی ہے، محبت رکھتی ہے۔ لیکن محبوب سے ناآشنا ہے وہ دلجمعی اور اطمینان سے ہمیشہ محروم رہتی ہے، اس کی تمام قوتیں ضائع ہوتی ہیں اور اس کی جد و جہد کبھی ایک منزل اور ایک مرکز پر قائم نہیں رہتی

شبے پیش خدا بگریستم زار　　　　مسلماناں چرا زارند و خوارند

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم　　　　دلے دارند و محبوبے ندارند

لیکن ان تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود وہ مسلمانوں سے بددل اور خدا کی رحمت سے مایوس نہیں، بلکہ اس مایوسی، دوسروں پر اعتماد کرنے اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی تلقین کرنے والوں پر سخت تنقید کرتے ہیں اور بڑے درد سے کہتے ہیں کہ حرم کے نگہبان بتخانہ کے پاسبان بن بیٹھے ہیں، ان کا یقین مردہ و مضمحل اور ان کی نگاہ مستعار اور رہین منت اغیار ہے۔

نگہبانِ حرم معمار دیراست | یقینش مردہ و چشمش بغیر است
زانداز نگاہ او تواں دید | کہ نومید از ہمہ اسباب خیراست

وہ کہتے ہیں کہ مسلمان اگرچہ بے خیل وسپاہ ہیں لیکن ان کا ظرف بادشاہوں سے زیادہ عالی اور نگاہ سلاطین سے زیادہ بلند ہے، اگر تھوڑی دیر کے لئے ان کو ان کا مقام دے دیا جائے تو ان کا یہ جمال جہاں افروز جلال عالم سوز کا منظر بھی پیش کر سکتا ہے۔

مسلماں گرچہ بے خیل وسپاہے است | ضمیر او ضمیر بادشاہے است
اگر او را مقامش باز بخشند | جمال او جلال بے پناہے است

وہ اپنا اور اس عصر کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ برسرپیکار ہیں اور جو قدم قدم پر انکے لئے ایک مستقل آزمائش اور امتحان ہے۔

گہے رفتم گہے مستانہ خیزم | چہ خوں بے تیغ و بے شمشیر ریزم
نگاہ التفاتے بر سرِ بام | کہ من با عصر خویش اندر ستیزم

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال کی پوری زندگی عصر جدید سے کشمکش میں گزری، انھوں نے مغربی تہذیب اور مادی فلسفہ کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس پر آگے بڑھ کر سخت تنقید کی اس کو چیلنج کیا، اور بڑی جرأت روشن ضمیری اور گہرائی کے ساتھ اس کو کھوٹا ثابت کیا اور اس پردۂ فریب کو چاک کیا جس نے اس کی اصلی اور مکروہ شکل کو نگاہوں سے چھپا رکھا تھا، وہ حقیقت میں نئی نسل کے مربّی یقین و خود اعتمادی، نیز اپنی اور اسلامی شخصیت کے مکمل شعور کے حامل اور مادی بنیادوں اور مادی طرز فکر کے زبردست منکر تھے اور ان کو یہ کہنے کا حق حاصل تھا۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من | ازو آموختم اسرارِ جاں من
بدورِ فتنۂ عصر کہن او | بہ دورِ فتنۂ عصر رواں من

وہ مغربی علوم سے اپنی بغاوت، اس کے جال سے بچ نکلنے اور اپنے عقیدہ و ایمان اور خصوصیات کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے بڑا قلندرانہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے مغربی فلسفہ و تہذیب کے آتش نمرود میں شانِ ابراہیمی کا مظاہرہ کیا، وہ فخرو مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ انھوں ان علوم کے مغز کو حاصل کرلیا پوست کو پھینک دیا اور یہی نہیں بلکہ کامیابی کے ساتھ اس کے جال سے باہر بھی آگئے اور اس کے طلسم ہوشربا کو پاش پاش کردیا جس نے مشرق و مغرب دونوں کی نظربندی کر رکھی ہے۔

طلسمِ علم حاضر را شکستم　　　ربودم دانہ ودامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم　　　بہ نار او چہ بے پروا نشستم

وہ اپنی اس زندگی کا ذکر کرتے ہیں جو یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں گزری تھی اور جہاں خشک و افسردہ کتابوں، دقیق فلسفیانہ مباحث، جمال فتنہ انگیز اور دل آویز و خوشنما مناظر کے سوا انھیں اور کچھ نہ مل سکا، اگر کوئی چیز ملی تو وہ خود فراموشی تھی جس نے ان کو ان کے وجود سے بھی محروم کر دینا چاہا۔

بہ افرنگی بتاں دل باختم من　　　زتابِ دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتم بیگانہ بودم　　　چو دیدم خویش را نشناختم من

اب بھی جب ان کو ان دونوں کی ویرانی و بے نوری یاد آتی ہے ان کی طبیعت پر وحشت و انقباض طاری ہوجاتا ہے۔

وہ بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں کہ میخانۂ مغرب میں بیٹھ کر مجھے سوائے دردِ سر کے اور کچھ نہ ملا، اس سے زیادہ بے سوز، بے نور اور بے کیف شب و روز مجھے اپنی پوری عمر میں یاد نہیں جو ان دانشمندان فرنگ کے ساتھ گزرے۔

مے از میخانۂ مغرب چشیدم | بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم بانکویانِ فرنگی | ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

پھر بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں میں تو آپ کے ایک فیض نگاہ کا پروردہ ہوں "اہل دانش اور اہل خرد" کی یہ ساری نکتہ آفرینیاں اور لن ترانیاں میرے لئے دردِ سر کا سامان اور وبالِ جان ہیں، میں تو صرف آپ کے در کا فقیر ہوں آپ کی گلی کا سائل ہوں مجھے کسی کے سنگ آستاں پر سر پھوڑنے اور قسمت آزمانے کی کیا ضرورت؟

فقیرم از تو خواہم ہرچہ خواہم | دل کوہے خراش از برگ کاہم
مرا درس حکیماں دردِ سر داد | کہ من پروردۂ فیض نگاہم

پھر وہ اس طبقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو علم دین کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے وہ اسکی خشکی، جمود، محبت اور سوز دروں سے محرومی، معلومات کی گرم بازاری اور اصطلاحات کی گراں باری کا شکوہ کرتے ہوئے بڑے شاعرانہ اور بلیغ انداز میں کہتے ہیں کہ اس کا صحرائے حجاز زمزم سے خالی اور بیت اللہ سے محروم ہے وہ کہتے ہیں کہ حجاز کے ریگستان کی قیمت تو بیت اللہ اور آبِ زمزم سے ہے، اگر یہ نہ ہوں تو ان تپتے ہوئے بیابانوں اور خاموش پہاڑوں سے کیا فائدہ؟ اسی طرح وہ عالمِ دین کتنا مفلس اور نادار ہے جو علم وافر، زبان گہر افشاں اور ذہن رسا کا مالک ہے لیکن اسکی آنکھ محبت کے ایک آنسو اور دل ایک تڑپ سے بھی ناآشنا ہے، جس کے حصہ میں اس سرزمین مقدس کی صرف سختی اور گرمی آئی ہے خنکی اور نمی نہیں آئی۔

دلِ ملا گرفتارِ غمے نیست | نگاہے ہست در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتبِ او | کہ در ریگ حجازش زمزمے نیست

وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار غیر اللہ پر بھروسہ کیا اور اس کی سزا میں دو سو بار اپنے

مقام سے نیچے گرایا گیا، یہ وہ جگہ ہے جہاں زورِ شمشیر اور حسنِ تدبیر کام نہیں آتا، یہ تقدیر الٰہی اور مشیت ایزدی کا مقام ہے، اور اس میں ایک لغزش قدم آدمی کو بہت نیچے گرا سکتی ہے۔

دلِ خود را بدستِ کس ندادم　　　گرہ از روئے کار خود کشادم
بغیر اللہ کردم تکیہ یک بار　　　دو صد بار از مقامِ خود فتادم

وہ کہتے ہیں کہ اس بے اخلاص و بے سوز عہد میں جو منفعت و مصلحت کے سوا کسی اور چیز سے آشنا نہیں، اور جس کا مصنوعی یا حیوانی دل ہر قسم کے لطیف احساسات اور مخلصانہ جذبات سے عاری ہے میرے لئے سوز دروں کی آگ میں جلنے اور خونِ جگر پینے کے سوا اور کیا ہے۔

نگاہم زانچہ بینم بے نیاز است　　　دل از سوزِ درونم در گداز است
من و ایں عصر بے اخلاص و بے سوز　　　بگو با من کہ آخر ایں چہ راز است

وہ کہتے ہیں مشرق و مغرب کسی جگہ میرا کوئی ہمدم و ہمراز نہیں، میں اپنا غمِ دل خود اپنے ہی دل سے کہتا ہوں اور اپنے کو بہلاتا ہوں۔

من اندر مشرق و مغرب غریبم　　　کہ از یاران محرم بے نصیبم
غم خود را بگویم با دلِ خویش　　　چہ معصومانہ غربت را فریبم

ان کو اس کی شکایت ہے کہ ان کی مخلصانہ نصیحتوں اور مشوروں پر کسی نے عمل نہیں کیا اور ان کے نخلِ علم کا کسی نے پھل نہ کھایا، انھوں نے شاعری میں جس سروش غیب کی ترجمانی کی اس پر کسی نے کان نہ دھرا، سب ان کو ترجمان حقیقت کے بجائے محض غزل خواں اور غزل گو سمجھتے رہے۔

بآں رازے کہ گفتم پے نہ بردند　　　ز شاخِ نخل من خرما نخوردند
من اے میرامم داد از تو خواہم　　　مرا یاراں غزل خوانے شمردند

وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کرتے ہیں آپ کا حکم اور فرمان تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو زندگی اور بقا و دوام کا پیغام پہونچاؤں، لیکن یہ ناحق شناس مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ عام اور پیشہ ور شعراء کی طرح میں لوگوں کی تاریخ وفات نکالتا اور قطعہ تاریخ کہتا رہوں۔

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئے | بگوش مردہ پیغام جاں گوئے
ولے گویند ایں ناحق شناساں | کہ تاریخ وفات ایں وآں گوئے

وہ بڑے درد و سوز اور بڑی حسرت اور تلخی کے ساتھ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ علم اور وہ پیغام جو ان کے اشعار کی روح اور اصل قیمت ہے اس سے لوگوں کو سب سے کم دلچسپی ہے اور اس میں انھوں نے بڑی قناعت اور زہد کا ثبوت دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اپنی ساری متاع کھول کر میں نے بازار میں رکھ دی لیکن کوئی اس جنس نایاب کا خریدار نہ ملا، میں نے ارمغانِ دل پیش کرنا چاہا لیکن اس کا بھی کوئی قدرداں نظر نہ آیا، مجھ سے زیادہ غریب الوطن، بیگانہ اور تنہا اس دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے۔

متاعے داشتم غارت گرے نیست | ولے بر کف نہادم دلبرے نیست
مسلمانے ز من تنہا ترے نیست | درونِ سینۂ من منزلے گیر

آخر میں وہ سلطان ابن سعود کو خطاب کرتے ہیں لیکن ان کا روئے سخن دراصل تمام عرب بادشاہوں اور عالم اسلام کے سربراہوں کی طرف ہے اس میں انھوں نے غیرملکیوں پر اعتماد کے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور ان کے بجائے خدا پر اور اس کے بعد خود پر بھروسہ کرنے کی دعوت دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر طناب تمہاری ہے تو جہاں چاہو اور جس وقت چاہو اپنا خیمہ گاڑ سکتے ہو اور ہر جگہ منزل بنا سکتے ہو اور اگر وہ نہیں تو پھر مستعار لے کر تم آزادی کے ساتھ کوئی قدم نہیں بڑھا سکتے۔

وہ کہتے ہیں کہ ذرا اپنے کو پہچاننے کی کوشش کرو، اس روئے زمین میں تم کو وہ مقام حاصل ہے جس کی شام دوسروں کی سحر سے زیادہ آئینہ فام ہے۔

ترا اندر بیابانے مقام است | کہ شامش چوں سحر آئینہ فام است
بہر جائے کہ خواہی خیمہ گستر | طناب از دیگراں جستن حرام است

شکوہ اور مناجات

اقبال مردِ مومن تھے۔ ایمان و یقین پر انھیں پورا بھروسہ تھا، وہ اسے اپنی قوت کا راز اور سرمایۂ اعزاز سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ علوم و معلومات کا دفترِ بے پایاں سیدھے سادے ایمان کے سامنے بھی ہیچ ہے وہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ مردِ فقیر تو لا الٰہ الا اللہ پر پختہ یقین اور اس کے کھلے ہوئے معنوں کی تصدیق کے سوا کچھ نہیں رکھتا لیکن فقیہ و خطیب اس کی تعبیروں کا ایک انبار لگائے بیٹھے ہیں لیکن معنی تک اور اس کے عملی تقاضہ تک ان کی رسائی نہیں گویا ان قارونوں کو اپنے خزانے سے مستفید ہونے کا حوصلہ نہیں،

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا، فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!

اسی طرح پیغام محمدی اور شخصیتِ نبیؐ سے انتساب انھیں ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھا وہ ان کے سوا کسی اور مکتب فکر سے استفادہ اور کسی اور سرچشمہ سے سیرابی غیرت و محبت کے خلاف

سمجھتے تھے وہ اپنے ایک شعر میں بڑے پرتاثیر لہجے میں عرض رسا ہیں:

خواجۂ ما نگاہ دار آبروئے گدائے خویش

آنکہ ز جوئے دیگراں پر نکند پیالہ را

آخر عمر میں ان کی بیماری کا سلسلہ چل رہا تھا اور وہ بھوپال میں مقیم تھے کہ ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو عالم اسلام کے افسوسناک حالات، اس کی روحانی و فکری پسماندگی اسلامی شخصیات کے فقدان نئی نسل کے مغربیت کی طرف رجحان اور اپنے پیغام سے غفلت کے احساسات نے انھیں بیقرار کر دیا اور اس موقع پر جذبات کی شدت نے ان سے بہت سے مؤثر شعر کہلوائے۔ ان میں انھوں نے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض و معروض کی اور عالم اسلام کی ذہنی اور عملی پسماندگی عروج کے بعد زوال، اور نشاط کے بعد اضمحلال کی شکایت کی اور کہا کہ "حضور! میں اس امت کی شکایت کرنا چاہتا ہوں جس پر آج موت کا خوف طاری ہے آپ نے لات و منات کے بُت توڑ دئے اور دنیا کی از سر نو تعمیر کی اور اس کی بوڑھی ہڈیوں میں جوانی کا خون دوڑا دیا جس کے نتیجے میں آج دنیا میں ایمان و یقین، ذوق و شوق اور عبادت و تقویٰ کا دور دورہ ہے اور آپ کے کلمہ سے وہ بیداری اور حضوری اور نور و سرور حاصل کر رہی ہے ہم بھی ایک بُت پرست ملک میں پیدا ہوئے لیکن گائے بیل کی پوجا سے ہم بلند ہو گئے اور پروہتوں اور سنیاسیوں کے آگے سر نہیں جھکایا اور نہ دیوی دیوتاؤں کو سجدے کئے اور نہ بادشاہوں اور وزیروں کے آستانے کی خاک بوسی کی۔ یہ سب آپ کے دین اور آپ کی محنت کا نتیجہ ہے ہم نے بھی آپ کے اس "خوانِ یغما" سے زلہ ربائی کی ہے جس سے ایک عالم سیر ہو رہا ہے۔ آپ ہی کی ذات اور آپ کے ارشادات اس امت مرحومہ کا سرمایۂ ذوق اور مصدر شوق صدیوں سے بنے رہے ہیں۔ اور آپ کی تعلیمات ہی کے سبب یہ امت، فقیری میں خوددار، اور محتاجی میں بھی بے نیاز اور آبرودار رہی ہے لیکن

آج عالم اسلام نے اپنی قوت وقیمت کا بیشتر حصہ کھو دیا ہے:

اے تو مابے چارگان را ساز و برگ ・ وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را ・ تازہ کردی کائنات کہنہ را
در جہاں ذکر و فکر و انس و جاں ・ تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگ اذاں
لذت سوز و سرور از لا الٰہ ・ در شب اندیشہ نور از لا الٰہ
نے خدا ہا ساختیم از گاو و خر ・ نے حضور کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیش معبودانِ پیر ・ نے طواف کوشک سلطان و میر
ایں ہمہ از لطف بے پایانِ تست ・ فکر ما پروردۂ احسانِ تست
ذکر تو سرمایۂ ذوق و سرور ・ قوم را دارد بہ فقر اندر غیور
اے مقام و منزل ہر راہ رو ・ جذب تو اندر دل ہر راہ رو
ساز ما بے صوت گردید آنچناں ・ زخمہ بر رگہائے او آید گراں

اقبال خدمتِ رسالتمآب میں کہتے ہیں" میں عالم اسلام میں بہت پھرا اور عرب وعجم کو دیکھا لیکن آپ کے پیروؤں اور یاد کرنے والوں کو بہت کم لیکن ابولہب کے نام لیواؤں کو ہر جگہ پایا اسلامی جوانوں کے دماغ روشن لیکن قلب و ضمیر تاریک ہو گئے ہیں ان کی جوانی نرمی و نزاکت کا نمونہ ہے رجائیت، اور بعد نظر سے ان کا دامن خالی ہے وہ غلامی کی افتاد پر پیدا ہو رہے ہیں۔ اور اسی طرح کی نسلیں یکے بعد دیگرے جنم لے رہی ہیں وہ خوے غلامی میں اتنے پختہ ہیں کہ آزادی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ تعلیم جدید نے ان سے دینی احساسات چھین کر انھیں بے حیثیت بنا دیا ہے وہ مغرب کے پیچھے دیوانہ وار چلے جا رہے ہیں لیکن انھیں اپنی قیمت کا پتہ نہیں وہ غرب سے بھیک مانگتے اور اس کے بدلے اپنی روح اور ضمیر کو بیچتے ہیں اس طرح یہ شاہین زادے

وہ ممولے بن گئے ہیں جو فضا کی وسعتوں کی تاب ہی نہیں لا سکتا،

نئی نسل کے معمار ، اور اساتذہ بھی چونکہ نکمے ہیں اس لئے وہ بھی انھیں خودی کی تعلیم نہ دے سکے اور نہ انھیں ان کے منصب و مقام سے آگاہ کر سکے آتش فرنگ نے نئی نسل کو موم کی طرح پگھلا دیا اور اسے اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

مسلمان آج موت و شہادت کی لذت سے بے خبر ہو چکا ہے اور لا غالب الا اللہ کا یقین کھو چکا ہے اب اسے حیات چندروزہ ہی کی فکر ہر دم لگی رہتی ہے اور ایک روٹی کے لئے سو انسانوں کی خوشامد اس کا پیشہ بن گیا ہے فرزند ابراہیمؑ آج بت شکنی کے بجائے بت تراشی کر رہا اور افرنگ سے نئے اصنام درآمد کر رہا ہے۔ یہ نسل نشاۃ ثانیہ کی محتاج ہے۔ آج اس سے پھر قم باذن اللہ کہنا ہوگا، ہمیں مغرب نے مسحور ہی نہیں کیا بلکہ بغیر لڑے اس نے ہمارا خاتمہ کر دیا، آپ کے اصحاب نے قیصر و کسریٰ کے تخت ویران کر دئے تھے آج پھر اس مردِ مومن کی ضرورت ہے جو ایمان و یقین سے تہذیب جدید کے سحر و اثر کا طلسم توڑ دے:

در عجم گردیدم و ہم در عرب — مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ — ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ!

در جوانی نرم و نازک چوں حریر — آرزو در سینۂ او زود میر

ایں غلام ابن غلام ابن غلام — حریت اندیشۂ او را حرام

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود — از وجودش ایں قدر داند کہ بود

ایں ز خود بیگانہ ایں مست فرنگ — ناں جوی خواہد از دست فرنگ

ناں خرید ایں فاقہ کش با جانِ پاک — داد ما را نالہ ہائے سوزناک

دانہ چیں مانند مرغان سرا است — از فضائے نیلگوں نا آشنا است

شیخ مکتب کم سواد و کم نظر — از مقام او نداد او را خبر
آتشِ افرنگیاں بگداختش — یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش

مومن واز رمزِ مرگ آگاہ نیست — در دلش لاغالب الا اللہ نیست
ماہمہ افسونیٔ تہذیب عرب، — کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو ازاں قومے کہ جامِ او شکست — وانمایک بندۂ اللہ مست

اقبال التجا کرتے ہیں" اے شہسوارِ عرب! خدارا ذرا دیر کے لئے رکاب بوسی کا موقع دیجئے کہ اپنے احزان و آلام کا بیان کرسکوں حالانکہ میری زبان چپ اور ناطقہ سربگریباں ہے اور شوق و ادب میں کشمکش ہے، شوق کہتا ہے کہ دوست قریب ہے۔ تابِ گویائی پیدا کر! اور ادب مانع ہوتا ہے کہ فضول گوئی چھوڑ۔ لب بند کر اور آنکھیں کھول۔ لیکن توسنِ شوق ادب کے قابو سے نکلا جاتا ہے۔

حضور میں وہ صید دور افتادہ ہوں جسے کسی صیاد نے نہیں پوچھا لیکن وہ آپ کی طرف بھاگ کر اور ایک امید لیکر آیا، میری آواز ہجوم آرزو سے دب گئی ہے اور دل کا شعلہ زبان تک نہیں آتا، میری آتش نفسی اب دل کی آگ سے خالی ہو رہی ہے اور قرآنِ فجر کی لذت سے محروم ہوا جاتا ہوں وہ نفس جس کی گنجائش سینے میں نہ ہو وہ اس میں اسیر بن کر ہی رہ سکتا ہے حالانکہ اس کے لئے تو اسے لامحدود فضاؤں کی حاجت اور بیکراں آسمانوں کی ضرورت ہے میری جسمانی اور روحانی بیماریوں کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ آپ ایک نظر سے ہمیں نوازدیں، طبیبوں کے نسخے میری بیمار روح کے لئے سازگار نہیں میری لطافت طبع کڑوی کسیلی دواؤں کی متحمل نہیں میرے گریۂ پیہم پر رحم کیجئے اور کوئی داروئے خوشگوار تجویز کیجئے میں بوصیری کی طرح عرض پرداز ہوا ہوں کہ مری نوائے رفتہ مجھے واپس ملے۔ گنہگار ہی آپ کی شفاعت کے زیادہ مستحق ہوتے

ہیں...... اور شفیق مائیں اپنے بے ادب بچوں ہی کو زیادہ چاہتی ہیں:

گرد تو گردد حریم کائنات ــــ از تو خواہم یک نگاہِ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی ــــ کشتی و دریا و طوفانم توئی!
اے پناہ من حریم کوئے تو ــــ من بامیدے رمیدم سوئے تو
آہ ازاں دردے کہ در جان و تن است ــــ گوشۂ چشم تو داروئے من است
چوں بصیری از تو می خواہم کشود ــــ تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است ــــ در خطا بخشی چو مہر مادر است

اقبال اپنی عرض جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں میں پرستارانِ شب کے ساتھ ہمیشہ جنگ آزما رہا ہوں، میری قندیل کو اور فروزاں کر دیجئے آپ کا وجود دنیا کے لئے فصل بہار تھا اور چمن انسانیت کے لئے موسم خوشگوار، کیوں نہ نسیم جانفزا کا ایک جھونکا میری طرف بھی آنکلے اور آفتاب عالمتاب کی ایک کرن ذرۂ حقیر کو چمکا دے۔ جسم کی قیمت روح سے ہے اور روح، محبوب کے دم سے ہے۔

میری روشنیٔ طبع نے فقہ و اسرارِ دین و شریعت تک پہنچا دیا لیکن میدانِ عمل میں میری ہمت جواب دے گئی۔ میری مہم فرہاد خارا شکن سے بھی زیادہ مشکل اور روح فرسا ہے مجھے اس سے زیادہ قوت و ہمت اور صلاحیت کی ضرورت ہے کہ میں عصرِ حاضر میں اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر سکوں۔ آپ میری شمشیر آبدار کی سان تیز کر دیں کہ یہ کند ہے لیکن جوہر سے خالی نہیں۔

میں نے اگرچہ اپنی زندگی ضائع اور جوانی رائگاں کی ہے لیکن ایک شئے لطیف جسے "دل" کہتے ہیں اسے میں نے محفوظ رکھا ہے اس کے بارے میں میں ہمیشہ خود دار و غیرت مند رہا لئے

کہ اس پر شروع ہی سے آپ کے سمندِ ناز کا نقشِ کفِ پا ثبت تھا ——— جو غلام دنیا سے کوئی مطلب نہیں رکھتا وہ اپنے مالک ہی کی رضا اور مہربانی کا جویا رہتا اور اس کے ہجر و فراق کو موت سمجھتا ہے۔

اے وہ برگزیدہ ہستی! جس نے کُردی کو سوزِ عربی بخشا، ایک ہندستانی کو بھی اجازت مرحمت فرما کہ وہ حاضری دے اور کچھ عرض کرے وہ ایک دلِ خوں گشتہ اور ایک جگرِ تفتہ لے کر خدمت میں آیا ہے اس کے جاننے والے دوست اور عزیز بھی یہ نہیں جانتے کہ اس کے غم والم کا کیا حال ہے؟ میں وہ بانسری ہوں جو اپنی اصل سے جدا ہے لیکن عہدِ وصال کی یادیں نغمہ ہائے فراق اسکے سینے میں گونج رہے ہیں اور غمِ جدائی کی شکایت سے اس کا دل لبریز ہے میں وہ چوبِ خشک صحرا ہوں جسے کاروان آگ لگا کر روانہ ہوگیا اور اسے پیچھے چھوڑ گیا لیکن وہ مسلسل جلتی رہی اور اس کا وجود شعلہ و شرار بنکر بکھرتا رہا لیکن اس کی نیم سوختگی کو کسی اور کارواں کی تلاش اور اب تک اس کا انتظار ہے کہ وہ اس کے وجود کو سراپا سوز بنادے:

اے وجودِ تو جہاں را نوبہار — پرتوِ خود را دریغ از من مدار
خود بدانی قدرِ تن از جاں بود — قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود
تا ز غیر اللہ ندارم ہیچ امید — یا مرا شمشیر گرداں یا کلید
فکرِ من در فہمِ دیں چالاک و چست — تخمِ کردارے ز خاکِ من نرست
تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من — محنتے دارم فزوں از کوہ کن
مومنم از خویشتن کافر نیم، — بر فسانم زن کہ بدگوہر نیم
گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است — چیزکے دارم کہ نامِ او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں — کز سمِ شبدیزِ تو دارد نشاں

بندۂ را کو نخواہد ساز و برگ　　زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ
ایکہ دادی کُرد را سوزِ عرب　　بندۂ خود را حضورِ خود طلب
بندۂ چوں لالہ داغے در جگر　　دوستانش از غمِ او بے خبر
بندۂ اندر جہاں نالاں چو نے　　تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے
در بیاباں مثلِ چوبِ نیم سوز　　کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز
اندریں دشت و دَرے پہناورے　　بو کہ آید کاروانے دیگرے
جاں ز مہجوری بنالد در بدن　　نالۂ من وائے من اے وائے من[1]

---

[1] پس چہ باید کرد ۱۷-۶۴